سہ ماہی
کاروان ادب اسلامی

جلد نمبر:۱۶ اپریل-جون ۲۰۰۹ء شمارہ نمبر:۱

مجلس مشاورت

○ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، لکھنؤ
○ مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، لکھنؤ
○ مولانا محمود الحسن ندوی، دہلی
○ مولانا حافظ فضل الرحیم
○ ڈاکٹر محمود الحسن عارف
○ مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

مدیر مسئول

○ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
(ناظم شعبۂ برصغیر)

مجلس ادارت

○ مولانا نذر الحفیظ ندوی، لکھنؤ
○ ڈاکٹر شفیق احمد ندوی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
○ ڈاکٹر تابش مہدی، دہلی
○ ڈاکٹر سید ضیاء الحسن، لکھنؤ

معاون انتظامی: اقبال احمد ندوی
معاون طباعت: انیس احمد ندوی

کمپوزنگ: حشمت علی، ڈالی گنج، لکھنؤ
طباعت: پاریکھ آفسیٹ پریس، لکھنؤ

-: زرتعاون :-

اس شمارہ کی قیمت: ۴۰ روپے، سالانہ برائے ہندوستان ۱۵۰ روپے
پاکستان و بنگلہ دیش: ۳۰۰ روپے یا ۱۰ امریکی ڈالر
ان کے علاوہ دیگر ممالک: ۴۰۰ روپے
چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں
RABITA-AL-ADAB-AL-ISLAMI (INDIA)

-: صدر دفتر :-

رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

اس شمارے میں

مناجات	نعیم جلال پوری	
نعت	ظفر	۲
اداریہ		
منزل بہ منزل	سید محمد رابع حسنی ندوی	۳
علمی وتاریخی مضامین		
اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کے...	ڈاکٹر بیسہ خاتون	۵
نواب شاہجہاں بیگم صاحب...	پروفیسر عبدالمجید خاں	۸
علامہ سید سلیمان ندوی اور بھوپال	سید شرافت علی ندوی	۱۱
مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندوی..	احمد علی حسنی ندوی	۱۵
اسلام، تصوف اور ادب..	سید مسعود الحسن	۲۱
قرآن کریم کا اعجاز اور اس کے فنی محاسن	رحمت اللہ نیپالی ندوی	۲۵
فکر وفن		
مفکر اسلام.....کا اسلوب نگارش	ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی	۲۷
نقد ونظر		
''الموعظۃ الحسنۃ''	محمد شعیب کوٹی	۳۰
ڈاکٹر محمود شیخ اور ان کی کتاب..	ڈاکٹر محمد اشفاق، ڈاکٹر صبا عظیم	۳۵
ماخوذ		
دو بلوں کا مکالمہ	مصطفیٰ صادق رافعی/محمد وثیق ندوی	۳۷
ادب اسلامی کے ترجمان		
سراج میر خاں: ایک شاعر درویش صفت	ڈاکٹر انیس سلطانہ	۴۱
کہانیاں		
ماں صاحب	ترنم ریاض	۴۳
بھول بھلیاں	پروفیسر معین الدین جینابڑے	۶۵
شعر وادب		
غزلیں	ڈاکٹر ظفر مرادآبادی	۷۱

نعت

ظفر

سرتاپا ہی صدق و صفا ہے آپ کی ذات
رحمتِ حق کا آئنہ ہے آپ کی ذات

ظلمتِ شب میں نور افزا ہے آپ کی ذات
ہر لمحہ معروفِ دُعا ہے آپ کی ذات

دنیا میں یوں لاکھوں پیغمبر آئے
سب سے افضل، سب سے جدا ہے آپ کی ذات

صحرا صحرا ذوقِ نمو بیدار کرے
محفل محفل حسنِ ضیا ہے آپ کی ذات

دنیا کے ہوں، یا ہوں مسائل عقبیٰ کے
ہر مشکل میں راہنما ہے آپ کی ذات

رحم ادا ہے اور کرم فطرت ان کی
خوش خلقی کا گنجینہ ہے آپ کی ذات

خود قرآن بھی کرتا ہے تعریف ان کی
کس درجہ محبوب خدا ہے آپ کی ذات

ہر عالم میں ان کا صدقہ مانگ ظفر
ہر عالم میں جود و سخا ہے آپ کی ذات!

☆☆☆☆☆

منزل بہ منزل

○ محمد رابع حسنی ندوی

ادب کلام انسانی کی ایک صنف ہے یہ کلام انسانی اگر اپنی فنی خصوصیات کے ساتھ ہو تو وہ دل کی زبان بن جاتا ہے، اور ادب کہلاتا ہے اور کلام انسانی جب دماغ کی زبان بنتا ہے تو علم وفکر کہلاتا ہے، اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے دل ودماغ دونوں کا حامل بنایا ہے، اور اس کو ان کی ترجمانی کی صلاحیت عطا فرمائی ہے، یہ صلاحیت عام حالات میں سوتی رہتی ہے اس کو جب بیدار کر کے اس سے کام لیا جائے، تو وہ آپس میں ایک دوسرے کے سامنے دل کی یا دماغ کی ترجمانی کرنے کا کام انجام دیتی ہے اور اسی طرح جس کا جیسا دل اور دماغ ہوتا ہے اسی کے مطابق اس کا عکس سامنے آجاتا ہے، یہ صلاحیت بنیادی طور پر فطری صلاحیت ہوتی ہے، اس کو بڑھایا اور اس سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جاسکتا ہے، ہمیں اس کی مثالیں انسانی فکر وفن کی تاریخ میں بہت ملتی ہیں اور اس کی کارگزاری سے انسانوں کو فائدہ بھی بہت پہونچا ہے اور پہونچتا ہے۔

انسان کی فکری کوششوں کے نتائج سامنے آئے ہیں، اسی طرح انسان کی فنی وادبی کوششوں کے بھی اعلیٰ نتائج سامنے آئے ہیں، اس کو بعض لوگ پیشہ ورانہ انداز میں بھی کرتے ہیں جو عموماً اندرونی صورت حال کی فطرح عکاسی نہیں ہوتی، ہمارا رابطہ ادب اسلامی اس پیشہ ورانہ ذہنیت کو دور کرنا چاہتا ہے اور فطری طریقہ کار کو زیادہ سراہتا ہے لیکن ادبی کوشش جس کی بھی طرف سے سامنے آئے خواہ وہ پیشہ ورانہ ادیب ہو یا پیشہ ور ادیب نہ ہو، فائدہ سے خالی نہیں سمجھتا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ جو رابطہ کے صدر بلکہ مؤسس تھے، انہوں نے ایک خطاب میں کہا تھا کہ:۔

''ادب ادب ہے خواہ وہ کسی مذہبی انسان کی زبان سے نکلے، کسی پیغمبر کی زبان سے ادا ہو، کسی آسمانی صحیفہ میں ہو، اس کی شرط یہ ہے کہ بات اس انداز سے کہی جائے کہ دل پر اثر ہو، کہنے والا مطمئن ہو کہ میں نے بات اچھی طرح کہہ دی، سننے والا اس سے لطف اُٹھائے اور اس کو قبول کرے..... حسن پسندی تو یہ ہے کہ حُسن جس شکل میں ہو اسے پسند کیا جائے، بلبل کو آپ پابند نہیں کر سکتے کہ اس پھول پر بیٹھے، اِس

پھول پر نہ بیٹھے، لیکن یہ کہاں کا حسن مذاق ہے اور یہ کہاں کی حق پسندی ہے کہ اگر گلاب کا پھول کسی مے خانہ کے صحن میں اس کے زیر سایہ کھلے تو وہ گلاب ہے اور اس سے لطف اٹھایا جائے اور اگر کسی مسجد کے چمن میں کھل جائے تو پھر اس میں کوئی حسن نہیں، کیا یہ جرم ہے کہ اس نے اپنے نمود اور اپنی جلوہ نمائی کے لیے مسجد کا سہارا لیا، اقبال کا شعر.....آپ کے سامنے پڑھ سکتا ہوں۔

حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟

ہمیں حسن بے پروا سے مطلب ہے کہ شہر و صحرا سے؟ تو ادب کے ساتھ معاملہ یہی کیا گیا"۔ (دین وادب، ص:۳۸)

ہمارے رابطہ ادب اسلامی کے سیمینار اپنے اسی نقطۂ نظر کے مطابق مختلف نئے موضوعات پر جگہ جگہ منعقد کئے جاتے ہیں اس کو ادب اسلامی کا عنوان اس لیے دیا گیا ہے کہ اسلام انسان کے فطری تقاضوں کو قبول کرتا ہے، یہ فطری تقاضے اگر دل سے تعلق رکھتے ہوں تو ان کو بھی موقع دیتا ہے اور دماغ سے تعلق رکھتے ہوں تو ان کو بھی موقع دیتا ہے، اسی طرح اسلامی نقطۂ نظر دماغ اور دل دونوں کے حق کو قبول کرتا ہے اور ان کی ترجمانی کے لیے فکر و فن دونوں کی اجازت دیتا ہے بلکہ ضروری حد تک ان کا حکم دیتا ہے، اسلام کے متعلق عام طور پر یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ وہ دل کے تقاضے کو تسلیم نہیں کرتا یہ صحیح نہیں ہے، ادب جو کہ دل کے فطری احوال کی ترجمانی کرتا ہے اسلام کے جائز کردہ دائرہ کے اندر آتا ہے، ہمارا رابطہ ادب اسلامی اسی نقطۂ نظر کی وضاحت اور اس کے اعلیٰ نمونوں کو سامنے لانے کی طرف توجہ دیتا ہے اور اس کے لیے نئے نئے موضوعات پر سیمینار منعقد کرتا ہے۔

بھوپال عالموں اور شاعروں کا ایک مرکز رہا ہے، وہاں کی مسلمان حکومت اہل علم و اہل اختصاص کی سرپرستی کرتی رہی ہے، اس سے علم و ادب کے لوگوں کو کام کرنے میں اور اپنے نتائج فکر پیش کرنے اور علمی و فنی کوشش کرنے میں مدد ملتی ہے، لہٰذا گذشتہ سیمینار بھوپال ہی کے ادیبوں اور ممتاز شخصیتوں پر منعقد کیا گیا، جس کے چند چیدہ مضامین کاروان ادب کے تازہ شمارہ میں دیے جا رہے ہیں، اس سے رابطہ کی کوششوں اور کارگزاری کا نمونہ سامنے آتا ہے، اس کے ساتھ مضامین کے دوسرے انواع کی نمائندگی بھی اس شمارہ میں کی گئی ہے، تاکہ ادب کے مختلف پھولوں کی نمائندگی ہو جائے، صرف ایک پھول کی نہ ہو، امید ہے کہ یہ پسندیدگی کے ساتھ دیکھا جائے گا۔

□□□

اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کے فرمانرواؤں کا حصہ

ڈاکٹر انیسہ خاتون

بھوپال علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کی مردم خیز مٹی میں علم وادب کی خوشبوئیں رچی بسی ہوئی ہیں۔ یہاں زبان و ادب کی ترقی میں فرمانرواؤں کا بھی بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اس سرپرستی کی کرنیں ہمیں ۱۸ویں صدی کے نصف آخر سے پھوٹتی نظر آتی ہیں۔

بھوپال کے فرمانرواؤں میں دیوان چھوٹے خاں، وزیر محمد خاں، نواب جہانگیر محمد خاں دولہ، نواب سکندر بیگم قدسیہ، نواب شاہجہاں بیگم، نواب سلطان جہاں بیگم اور نواب حمید اللہ خاں نے اردو کی گراں قدر سرپرستی کی اور شعر وادب میں خود بھی حصہ لیا جس سے بھوپال میں اردو کا شہرہ عام ہوا اور بھوپال ''بغداد الہند'' سمجھا جانے لگا۔

دیوان چھوٹے خاں (۱۷۸۰-۱۷۹۶) ایک روشن دماغ اور وسیع القلب انسان تھے اور علم وادب سے بے حد لگاؤ تھا، انھوں نے بھوپال میں زبان وادب کی سرپرستی کی اور سب سے پہلے مساجد میں مکاتب سرکاری نگرانی میں شروع کئے اور باہر سے آئے ہوئے لوگوں کی سرپرستی کی، اس لئے ان کی شہرت سن کر باہر سے کئی شعراء تشریف لائے۔ جن میں عنایت اللہ خاں نادان، سید مقصود عالم، امیر احمد انوروی، اور رحمت اللہ مجرم وغیرہ۔ ان شعراء نے آپ کی فرمائش پر گراں قدر تصانیف پیش کیں جن کے صلہ میں شعراء کو وظائف وجاگیریں عنایت کی گئیں۔

وزیر محمد خاں نے بھی شعراء کی سرپرستی کی ان کے زمانے میں بھی بہت سے نامی شاعر تھے جیسے امیر علی گوالیاری نے جنگ نامہ بھوپال لکھا۔ جس میں ۱۸۱۲ء کے واقعات نظم کئے گئے ہیں اس کے علاوہ مولوی نظام الدین نے مثنوی ''بے نمازی'' لکھی اور انعام واکرام حاصل کئے۔

نواب جہانگیر محمد خاں دولہ بہت کم وقت کے لئے فرمانروا رہے ہیں، انہوں نے بہت سے شعراء کو باہر سے بلا کر ان کی سرپرستی کی اور دربار میں جگہ دی، نواب صاحب خود بھی صاحب دیوان شاعر تھے جنکی انہوں نے سرپرستی کی، ان میں عبداللہ شاہ صوف، قاضی شریف حسین گنج بہاری، شریف حسین باذل، عبد القادر قادر، میر واصل علی واصل، قدرت اللہ بنارسی، غلام ضامن اور مولوی محمد عباس رفعت وغیرہ ہیں، آپ کے دور میں کثرت سے مشاعرے بھی منعقد ہوئے ساتھ ہی نثر میں بھی بکثرت ضخیم کتابیں تصنیف ہوئیں۔

نواب جہانگیر خاں بھوپال کے آٹھویں فرمانروا اور سکندر بیگم کے شوہر تھے اور خود بھی شعر وشاعری کا پختہ ذوق رکھتے تھے ساتھ ہی شعراء وادبا کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ اس لئے رام بابو سکسینہ تاریخ ادب اردو میں کہتے ہیں:

''نواب جہانگیر محمد خاں خود بھی شعر کہتے تھے اور تخلص دولہ کرتے تھے۔ ان کا دیوان مطبوعہ موجود ہے۔ (صفحہ ۱۴۰)

وہ ایک شوخ طبع اور رنگین مزاج انسان تھے، ان کے کلام میں ان کے دور کی کوئی جھلک نہیں ہے بلکہ عاشقانہ اور معاملہ بندی کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے جو محسوس کیا اس کی جھلک اپنے کلام میں پیش کی، ان کی زبان لکھنؤ اور دہلی

اسکول کا سنگم نظر آتی ہے۔

بھوپال کی بیگمات کا بھی اردو زبان و ادب کی ترقی میں نمایاں حصہ رہا ہے۔نواب گوہر بیگم قدسیہ نے شعراء و ادباء کی سرپرستی کی۔ان میں شاہ رؤف احمد رافت رامپوری، عبدالواحد مسکین، بہرے پیر صاحب اور عبدالقادر عثمانی وغیرہ کے نام مشہور ہیں۔وہ ایک خدا پرست خدا کو ماننے والی عدیلہ خاتون تھیں، عہد قدسی میں بھوپال میں شعر و ادب کی کونپلیں پھوٹیں۔علمی و دینی تصانیف کی شروعات ہوئی اور تاریخ کے عہد زریں کا اختتام ہوا۔

قدسیہ بھوپال کی فرمانروا نواتھیں ہی ساتھ ہی آپ کی ادبی اور علمی خدمات کا درجہ بھی بہت بلند ارفع اور اعلیٰ ہے۔آپ نے ۱۸۵۹ء میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیا اور فرمان جاری کیا کہ سارے سرکاری کام سختی سے اردو میں ہی کئے جائیں۔آپ نے آئین حکومت بھی اردو میں مرتب کرایا۔آپ نے دینی تعلیم، مذہبی تبلیغ اور واعظوں کا اہتمام کیا اور حجاج کے سفر حج کے مصارف بھی برداشت کئے۔مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی رباطیں تعمیر کروائیں۔

نواب سکندر بیگم صاحب کو بھی اردو زبان و ادب سے والہانہ لگاؤ تھا۔آپ نے اپنا روزنامچہ اردو میں لکھا۔تزک بابری کے انداز میں تزک سکندری تحریر کی جس کو بعد میں شاہجہاں بیگم نے اپنے عہد کے حالات شامل کئے اور ''تاج الاقبال تاریخ بھوپال'' کے نام سے اردو فارسی میں شائع کیا۔ ''سفرنامہ حجاز'' میں آپ نے سفر حجاز کے حالات بیان کئے ہیں۔آپ کی تیسری کتاب ''آئین سکندری'' ہے جو ریاستی احکامات کے لئے ایک آفشیل گائڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔جس کو نواب سلطان جہاں بیگم نے ۱۹۲۲ء میں شائع کیا۔آپ کے عہد میں اردو جرائد بھی زیادہ تعداد میں نکلنے لگے تھے۔آپ کے علمی و ادبی ذوق کی وجہ سے بھوپال علم و ادب کا معمورہ بن گیا۔

نواب سکندر بیگم عرق موتی بی بی نے قرآن کا ترجمہ سرکار قدسیہ سے پڑھا تھا یا تفسیر اخلاق اور دیگر علوم کا مطالعہ خود کیا۔سید عابد علی اپنی کتاب ''تاریخ ریاست بھوپال'' میں لکھتے ہیں کہ ''علم و معارف کی قدردانی اور بیرونی علماء و فضلاء کی عزت افزائی سے بھوپال ریاست کی نیک نامی کا شہرہ عالم اسلامی تک پہونچا۔(صفحہ ۸۲) اس طرح بھوپال روحانیت کا بھی مرکز بنا۔مدار المہام منشی جمال الدین کی تحریک پر قرآن حکیم کے ترجمے فارسی، اردو، ترکی اور پشتو زبانوں میں کرا کر شائع کیا اور مفت تقسیم بھی کرائے۔بیگم اس کے علاوہ ہندو مسلم یکجہتی کا بھی نمونہ تھیں۔

آپ نے رجب علی سرور سے بھی ایک حصہ فسانہ عجائب کی طرز پر لکھوایا جس کا نام ''شرار عشق'' رکھا گیا اور سرور کو ۵۰۰ روپیہ انعام سے نوازا گیا۔آپ نے سرسید کا بھی شاندار استقبال کیا۔اس کے علاوہ مولوی حیدر علی مناظر لکھنوی کے لیے ۵۰۰ روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا، اس کے علاوہ بے شمار لوگوں سے آپ نے کتابیں لکھوائیں اور انعام و اکرام سے نوازا اور کتب کو بھی طبع کروایا۔

نواب شاہجہاں بیگم کا عہد تو علم و ادب کا زریں عہد کہلاتا ہے، آپ نے اردو کے علاوہ دیگر علوم و فنون کی کتب لکھوا کر شائع کروائیں۔

نواب صدیق حسن خاں جو کہ ایک جید عالم فاضل تھے ان کی علمی اور ادبی لیاقت کو دیکھ کر شاہ جہاں بیگم نے ان سے عقد ثانی کیا۔بیگم نے طباعت پر ایک کثیر رقم خرچ کی بقول اسلم جے راج پوری:

''بھوپال کی حیثیت اس وقت بغداد الہند کی تھی''

آپ نے طباعت کے لئے مفت مطابع قائم کئے تا کہ زیادہ سے زیادہ کتب طبع ہو سکیں۔کتابیں مفت میں تقسیم کی جاتی تھیں۔اس دور میں بے شمار دواوین اور شعراء کے تذکرے شائع ہوئے۔اردو کا پہلا اخبار ۱۸۱۷ء میں نکلا، شعراء کو ملازمتیں فراہم کی گئیں اور مدارس بھی کھولے گئے۔سرکاری قوانین اور احکامات اردو میں سختی کے ساتھ مستعمل ہونے لگے

اور مشاعروں کی کثرت ہونے لگی۔

شاہ جہاں بیگم سے دو دیوان منسوب ہیں اور ایک طویل مثنوی ''صدق البیان'' کے علاوہ کئی نثری کتب اور خزینۃ اللغات بھی ہے۔ آپ کی بدولت شعراء کے علاوہ شاعرات بھی نوازی گئیں اور شعر و شاعری کا مذاق عام ہوا۔ کئی شاعرات صاحب دیوان ہوئیں ہیں۔ آپ خود بھی اعلیٰ درجے کی شاعرہ تھیں اور شاعرات نواز بھی۔

نواب سلطان جہاں بیگم ایک بہت ہی بلند پایہ مصنفہ تھیں آپ سے ۴۱ ضخیم کتب منسوب ہیں، آپ نے بھوپال اور باہر سے آنے والے شعراء کی سرپرستی کی، بے شمار کتب طبع کروائیں، اردو میں جدید علوم شامل کئے۔ ریاستی قوانین اردو میں لاگو کئے۔ تاریخ کے دفتر قائم کروا کر جدید تقاضوں سے اردو کو روشناس کرایا۔ ''الحجاب'' اور ''ظل سلطانی'' ماہنامے جاری کرائے۔ اردو کی خدمت کرنے والے اداروں کی سرپرستی کی اور مالی امداد کی، آپ کی بدولت بھوپال میں اردو کا ایک بلند معیار قائم ہوا۔

نواب حمید اللہ خاں مرحوم نے بھی اردو کی گراں قدر سرپرستی کی اور اردو کتب کی طباعت میں نمایاں رول ادا کیا۔ انہوں نے غالب کے قدیم دیوان کی اعانت کی جسے مفتی انوارالحق نے ''نسخۂ حمیدیہ'' کے نام سے طبع کرایا۔ انہوں نے شعراء کی سرپرستی کی۔ علامہ اقبال اور حفیظ جالندھری کے وظائف مقرر کئے۔ آل انڈیا مشاعروں کی ہمت افزائی اور سرپرستی کی۔ بھوپال کے الگنڈرہ ہائی اسکول کو جامعہ عثمانیہ (یونیورسٹی) سے ملحق کرا کر بھوپال میں اردو کو جدید علوم سے روشناس کرایا۔ انہوں نے ہی سلیم حامد رضوی کی کتاب ''اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ'' کی طباعت کے لئے اشارہ کیا تھا جس کے لئے ان کی وفات کے بعد ساجدہ سلطان بیگم نے طباعت کے لئے گرانقدر رقم فراہم کرائی۔

☆☆☆☆☆

نعت

سر عقیدت کا جھکا دو ان کے سنگِ در کے پاس
کوئی پتھر آ نہیں سکتا تمہارے سر کے پاس

روضۂ اطہر پہ ہر دم بارشِ انوار ہے
ہوگیا طاہر جو پہنچا روضۂ اطہر کے پاس

اُن سے ہٹ کر گمرہی ہی گمرہی ہے دوستو!
اپنے گھر کا راستا پوچھو گے اپنے گھر کے پاس

بزم ہو یا رزم ہو یا سبز گنبد کی فضا
چاہنے والے بہر صورت ہیں پیغمبرؐ کے پاس

چاہنے والوں کو چاہو گے تو مل جائے گا جام
ایک پیمانہ یہی ہے ساقیِ کوثرؐ کے پاس

یہ وہ سرمایہ ہے جو ہر ایک کو ملتا نہیں
خاکِ پا حضرت فریدیؒ[1] کی جو ہے، افسرؔ کے پاس

افسرؔ امروہوی

مغل گیٹ، محلہ چاہ غوری، امروہہ

□□□

(۱) حضرت مولانا سلیم احمد فریدی امروہویؒ

پروفیسر عبدالمجید خاں

نواب شاہجہاں بیگم صاحب

شخصیت اور شاعرانہ کمالات

وسط ہند کی سابق ریاست ''بھوپال'' اگرچہ اپنی آبادی، رقبے اور مادی وسائل کے اعتبار سے ایک چھوٹی سی اور غیر اہم ریاست تھی۔ لیکن اس نے گوناگوں وجوہ کی بنا پر ہمیشہ اپنی انفرادیت اور نمایاں شناخت قائم رکھی۔ بیگمات بھوپال نہ صرف خود زیورِ تعلیم سے آراستہ تھیں بلکہ اپنے محدود ذرائع کے باوجود انہوں نے علم و ہنر کی سرپرستی اور ترویج و ترقی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

اب جبکہ اکیسویں صدی شروع ہو چکی ہے۔ عالمی پیمانے پر صنفی مساوات قائم کرنے کا شور ہے اور خواتین کو مردوں کے مساوی حقوق دئے جانے کا اور انہیں اپنے مسائل کے بارے میں غور و فکر کر کے خود اپنے فیصلے کرنے کے قابل بنانے کے لئے مقامی، ملکی اور بین الاقوامی پیمانے پر تحریکیں چلانے کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ سابق ریاست بھوپال کے قدیم باشندے فخر سے اپنا سر بلند کر کے بردران وطن کو بتا سکتے ہیں کہ ہماری ریاست میں تو یہ مقاصد انیسویں صدی کے نصف اول میں ہی حاصل ہو چکے تھے۔ ریاست بھوپال میں خواتین کو معاشرے میں ایک باعزت مقام حاصل رہا ہے۔

نواب قدسیہ بیگم، نواب سکندر جہاں بیگم، نواب شاہجہاں بیگم اور سلطان جہاں بیگم نے تقریباً ایک صدی تک سریر آرائے سلطنت رہ کر نہ صرف اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ خواتین عقل و تدبر، رموزِ مملکت و حکمرانی، بیدار مغزی سیاست کی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور سلجھانے کے معاملے میں مردوں سے کسی حالت میں بھی فروتر نہیں ہیں۔ بلکہ یہ بھی دکھادیا کہ تعمیر و ترقی کے تمام کاموں کو وہ مردوں سے بہتر طریقے سے انجام دے سکتی ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی کہ لگاتار چار بیگمات اتنے طویل عرصے تک سربراہان مملکت رہی ہوں۔

بیگمات کا دورِ حکومت امن و سلامتی، تعمیر و ترقی، خوشحالی اور بے فکری کا دور تھا۔ یہ زمانہ تمدنی، علمی و ادبی اعتبار سے ایک امتیاز کا حامل رہا ہے۔ ان بیگمات نے بھوپال کو جو خود قدرتی حسن و جمال سے مالا مال تھا، مزید خوبصورت بنانے اور علوم و فنون کی ترویج و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس دور میں بیگمات کی سرپرستی اور ان کے ذاتی ذوقِ لطیف کی وجہ سے یہ چھوٹی سی ریاست فنون لطیفہ، تعلیم و تعلم، شعر و ادب، فن تعمیر اور صنعت و حرفت وغیرہ کا گہوارہ بن گئی۔ بیگمات کے اس دور نے مذاق کو وہ شگفتگی دی ہے جو دربار کے تصنعات اور تکلفات سے گراں بار نہ ہو سکی۔ ان بیگمات میں سے اکثر نے شعر و ادب سے شغف رکھا اور اردو ادب کو اپنی گوہر بار فکر سے مالا مال کیا۔ ان میں خاص طور پر نواب شاہجہاں بیگم شیریں اور بعد میں تاجور تخلص اختیار کیا۔ خود ایک خوش ذوق اور صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔

اگر ایک طرف مشہور عالم تاج المساجد، جامع مسجد، موتی مسجد، صدر منزل، شاہی محلات و باغات بیگمات بھوپال کے تعمیری ذوق کے گواہ ہیں، تو دوسری جانب نواب صدیق حسن خاں کی تقریباً دو سو کتابوں کی تصانیف و تالیف ان کی علم دوستی و

علم پروری کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ بھوپال کے ایسے علم دوست وعلم پرور ماحول میں نواب شاہجہاں بیگم شیریں نے اس فضاء کو اپنے شعور میں غیر ارادی طور پر جذب کیا۔ انہوں نے اپنے شاعرانہ تخیل کو محض اپنے دماغ کی چہار دیواری میں اسیر رکھنے کے بجائے اس تخلیقی صلاحیت کو استعمال کیا اور کشورِ سخن میں ایک منفرد مقام حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی، تو یہ ان کا حق تھا۔

نواب جہانگیر محمد خاں کی صاحبزادی نواب شاہجہاں بیگم شیریں ایک خوش ذوق صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔ ان کا دیوان ''دیوانِ شیریں'' ۱۲۸۸ھ میں مطبع نظامی کانپور میں طبع ہوا۔ یہ دیوان ۱۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں حمد، نعت، غزلیات، قطعات اور متفرقات وغیرہ شامل ہیں۔ شیریں کی مثنوی ''صدق البیان'' اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ یہ مثنوی خداوند قدوس کی حمد سے شروع ہوتی ہے۔

دنیا کے بارے میں شیریں فرماتی ہیں کہ دنیا کی ہر شئے خدا تعالیٰ کے رحم وکرم پر ہے۔

دیا مہر اور مہہ کو تونے وہ نور
کہ روز و شب میں انہیں کا ظہور
نمایاں ہے صفت تیری ہر کہیں
بنائے ہے تونے زمان و زمیں
تجھے فوق سب پر ہے رب انام
تری ذات کو ہے ہمیشہ قیام

خدا تعالیٰ کی حمد کے بعد دوسرے باب میں حضرت محمد ﷺ کی شان میں نعت ہے۔ اس کے بعد چاروں خلفائے راشدین کا تذکرہ پھر مناجات ہے۔ اس کے بعد اصل موضوع کو اپنایا ہے جس کی ابتدا ''گردوں کی کیفیت'' سے ہوتی ہے، اس کے بعد آسمان کے بارہ بُرجوں کا حال ہے۔ ساتویں باب میں ''بیان ہونے والی فصلوں کا'' سب سے پہلے جاڑے کی فصل پھر گرمی اور بعد میں بارش کے بارے میں تحریر کیا ہے۔

لو آمد ہے اب چیت بیساکھ کی
کہ جس کی صفت ہم نے یہ ہے سنی
چنے اور گیہوں ہوں اس میں نصیب
شکم سیر ہوں تا امیر و غریب

اس کے بعد ''صفت کوہ ودریا'' ہے۔ اس میں درندوں، پرندوں، دریاؤں اور تالابوں اور دوسرے مناظر کا ذکر ہے۔ بھوپال کے مشہور آبشار بھدبھدلے کے بارے میں کہتی ہیں۔

گرے پانی جس کوہ سے غار میں
اسے بھدبھدہ لوگ سب کہتے ہیں
روانی ہو پانی کی اس روز سے
صدا کوسوں پہنچے بہت زور سے

ہندوستان میں ہونے والے تمام موسموں، تہواروں، رسومات، افلاک کا حال اور فصلوں وغیرہ کا تذکرہ نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔

مثنوی ''صدق البیان'' ۲۴۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اگر اس مثنوی کو اٹھارویں صدی کے مالوہ کی معاشرتی تاریخ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

''تہذیب النسوان وتربیت الانسان''

اس کتاب میں عورتوں کے امراض، ادویہ، ولادت، عقیقہ، تقریبات، غذا ولباس اور بیماری و علاج وغیرہ سلیس عبارت میں ۴۷۵ صفحات میں تحریر کی گئی ہے۔

شاہجہاں بیگم شیریں کی ایک قابل قدر اور نادر لغت ''خزینۃ اللغات'' کے نام ۱۸۸۷ء میں شائع ہو چکی ہے۔ جو ادبی دنیا کا بیش قیمت خزانہ ہے۔ شاہجہاں کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگرچہ عرب وعجم کی زبانوں میں لغات اور دواوین کا خزانہ موجود ہے اور اس میں بیشتر الفاظ موجود ہیں۔ لیکن کوئی ایسی لغت نہیں ہے جو کہ ان بیش قیمتی الفاظ کا احاطہ کر سکے۔ اس

چیز کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے یہ لغت انتہائی محنت، متانت اور حسن ترتیب کے ساتھ تالیف کی، سوائے ایک لغت کی کتاب ''نفائس اللغات'' کے کوئی دوسری لغت اس کے مساوی نہیں ہے۔ اس لغت میں صرف اردو، فارسی اور عربی کے لغات پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے عام رعایا کے فائدے اور عوام الناس کی تعلیم اور طلب گاران علم کے لئے یہ لغت تحریر کی۔ جس کا نام ''خزینۃ اللغات'' رکھا۔

اس میں چھ زبانوں کے لغات اردو، فارسی، عربی، سنسکرت، انگریزی اور ترکی کے تحقیق کے ساتھ فراہم کئے۔ اس کی خصوصیت میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ اردو کے حروف تہجی سے اس کی ابتدا کی ہے اس کے بعد سلسلہ وار فارسی، عربی، سنسکرت، انگریزی اور ترکی کے الفاظ لکھے گئے ہیں۔ یہ لغت چھ خانوں پر مشتمل ہے۔ پہلا خانہ اردو دوسرا فارسی، تیسرا عربی، چوتھا سنسکرت، پانچواں انگریزی اور چھٹا ترکی کا ہے۔ سنسکرت اور انگریزی کے خانوں میں سنسکرت کا لفظ سنسکرت میں اور انگریزی کا لفظ انگریزی زبان میں تحریر کیا گیا ہے۔ اوران دونوں زبانوں کا تلفظ اردو رسم الخط میں دیا گیا ہے۔ تاکہ اردو داں حضرات ان کے تلفظ سے واقف ہو جائیں۔ یہ لغت دو حصوں میں منقسم ہے۔ جزو اول میں ۴۳۷ صفحات اور جزو دوم میں ۵۷۲ صفحات ہیں۔ یہ لغت اس قسم کی پہلی لغت ہے جو ہندوستان میں شائع ہوئی ہے۔ حقیقت میں لغات کا خزانہ ہے۔

''تارج الاقبال'' ریاست بھوپال کی تاریخ ہے جو فارسی زبان میں تحریر کی گئی ہے، بانئ بھوپال سردار دوست محمد خاں سے لیکر نواب شاہ جہاں بیگم کے ابتدائی چار سال کے حالات تفصیل کے ساتھ درج کئے گئے ہیں، یہ کتاب ۱۶۹ سال کے تمام حالات کی مکمل تاریخ ہے۔ شاہجہاں بیگم شیریں کی شاعری میں ایسا لہجہ نظر آتا ہے جو شاید کوئی اختیار نہیں کرسکتا تھا۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شیریں کی شاعری نے روایت سے ہٹ کر کوئی نئی بات نہیں کہی۔ انہوں نے کوئی نیا آہنگ نہیں دیا، انہوں نے غزل کے مزاج اور رواج سے ہٹ کر کوئی نئی بات نہیں نکالی، پھر بھی ان کے اشعار کی تہہ میں ایک ایسا دھیما پن ہے اور ایسے احساسات کی متانت دبی ہوئی ہے جو بولتی تو نہیں مگر اپنا احساس ضرور دلاتی ہے۔ اور اسی اندرونی ٹھہراؤ نے ایک عجب ضبط کا انداز، انگشت بدنداں جیسی کیفیت اور ہتھیلی پر جھکی ہوئی پیشانی کا استغراق پیدا کردیا ہے۔ اس کیفیاتی تہ کے علاوہ ان کا لہجہ اپنی شائستگی سے ہم کو متاثر کرتا ہے۔ پھر بھی ہم اس ادیبہ وشاعرہ کو بھلا نہیں سکتے جس نے ادب وشاعری کو حسن بھی بخشا ہے، نکھار بھی اور ضبط بھی، نسوانی وقار اور استادانہ سلجھاؤ اور متانت بھی۔ شیریں کی شاعری میں وہ تمام جوہر موجود ہیں جو اچھی شاعری کی جان ہوتے ہیں۔

شیریں نے رفاہ عام کے کام بھی انجام دئے ہیں۔ قرآن مجید اور مذہبی کتابوں کی ہزاروں جلدیں مطبع شاہجہانی بھوپال میں طبع کرواکے تقسیم فرمایا کرتی تھیں۔ ان کو علوم مذہبی کی اشاعت کی طرف خاص توجہ تھی۔ انہوں نے انتہائی نایاب کتابیں جو تقریباً مفقود ہو چکی تھیں طبع کرواکر رعایا کے فائدہ کے لئے تقسیم کروائیں۔ ان میں نیل الاوطار، فتح بیان، تفسیر ابن کثیر، فتح باری اور شرح صحیح بخاری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میں سعدی شیرازی کے اس شعر پر اپنا مضمون ختم کرتا ہوں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

☆☆☆☆☆

علامہ سیدسلیمان ندوی

اور

بھوپال

سید شرافت علی ندوی

کبھی بھوپال دارالاقبال تھا اور اب وسط ہند کے مدھیہ پردیش کی راجدھانی ہے۔ ماضی، حال میں جس طرح یہ شہر بھوپال اسٹیٹ وایم پی کا دارالسلطنت رہا اس طرح علم وادب اور فنون عالیہ کا بھی مرکز رہا۔ خود اس شہر میں جو باکمال فرزندان حق وصداقت پیدا ہوئے اور جو اس کو دوسرے شہروں اور جگہوں سے اپنا مسکن ووطن بنایا۔ ایسی شخصیات کی فہرست طویل ہے۔ ان میں ایک ممتاز نام علامہ سید سلیمان ندوی کا ہے۔ شبلی کا یہ عظیم ترین شاگرد، مذہب وشریعت کا امام، علوم وفنون کا ماخذ و مصدر، تحقیق وتصنیف کا پیشوا اور سب سے بڑھ کر سیرت نگار رسول اکرم بھوپال کیا آیا علم وادب کی بہاریں ساتھ لایا۔

اسفار بھوپال اور سیرت النبی کی تالیف میں سرکار بھوپال کا تعاون

بھوپال اسٹیٹ کی فرمانروا سرکار سلطان جہاں بیگم نے سیرت النبیؐ کی طباعت واشاعت کے لئے علامہ شبلی نعمانیؒ کو اپنے پرخلوص تعاون کا وعدہ فرمایا تھا اور ایک خطیر رقم کا اجراء بھی فرمادیا تھا۔ پھر جب علامہ شبلی کی وفات ہوگئی اور اس سلسلۂ تعاون کی تجدید کی ضرورت ہوئی تو علامہ سید سلیمان ندویؒ ۲۹/نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمید الدین فراہی کے ساتھ بھوپال تشریف لائے، سرکار عالیہ سلطان جہاں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس بشارت کے ساتھ واپس ہوئے کہ سیرت کی ماہوار رقم بقیہ زمانہ مقرر تک جاری رہے گی۔ (حیات سلیمانی، ص:۹۷)

سیرۃ النبی جس کی جلد اول علامہ شبلی نعمانیؒ نے تصنیف کی اور بقیہ جلدیں علامہ سید سلیمان ندوی نے ریاست بھوپال ہی کے تعاون سے تصنیف کیں اور دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع کیں۔ اس کے علاوہ سید صاحبؒ کو سیرت عائشہ کی تکمیل میں بھی سرکار عالیہ کا تعاون حاصل رہا۔ ۳۰/جون ۱۹۱۴ء کو مولانا شبلی نعمانیؒ نے سیرت عائشہ کے سلسلہ میں سید سلیمان ندوی کو تحریر فرمایا ہے "آج بھوپال سے خط آیا ہے۔ حضرت عائشہ کی سوانح کا بڑا تقاضہ ہے یعنی جلد تیار کردو"۔ (مکاتیب شبلی حصہ دوم، ص:۱۱۰)

اس کے علاوہ ۱۶/اگست ۱۹۱۸ء کو سید صاحبؒ سیرت النبی جلد اول کی دو مطبوعہ نسخے لے کر خود بھوپال تشریف لائے اور نواب سلطان جہاں بیگم کی خدمت میں پیش کیں (حیات سلیمانی، ص:۱۲۹) اسی سفر میں دارالمصنفین کے پریس کی خریداری کے لئے تین ہزار روپیہ (جو اس زمانہ میں بہت بڑی رقم تھی) سید صاحب کو عنایت ہوئے۔ جولائی ۱۹۲۵ء میں بھی سید صاحب حیدرآباد جاتے ہوئے بھوپال آئے۔ یہ نواب حمید اللہ خاں کا زمانہ تھا، نواب سے ملاقات کی اور مختلف ملی مسائل پر گفتگو کی۔ کسی وجہ سے ریاست بھوپال سے جاری کردہ ماہانہ امداد دوسو روپیہ سے گھٹا کر نوے روپیہ کردی گئی تھی۔ اس

جانب نواب صاحب کی توجہ مبذول کردی گئی نواب صاحب نے اس کو حسب سابق کردیا۔

قیام بھوپال

ان اسفار کے علاوہ علامہ سید سلیمان ندویؒ باقاعدہ ریاست بھوپال کی درخواست پر بہ نیت سکونت وخدمت علمی و دینی جون ۱۹۴۶ء میں بھوپال آگئے اور بیک وقت دو عہدہوں پر مامور کئے گئے آپ کو ریاست بھوپال کا قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) بنایا گیا اور اسی کے ساتھ امیر جامعہ (ڈائرکٹر تعلیمات علوم مشرقی) کی ذمہ داریاں بھی سپرد کی گئیں۔سید صاحبؒ نے یہ خدمات اس شرط کے ساتھ قبول فرمائی تھیں کہ دارالمصنفین اعظم گڑھ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ان کا تعلق اور علمی و عملی ربط بدستور قائم رہے گا اور حسب ضرورت ان اداروں کی نگرانی کے لئے اعظم گڑھ اور لکھنؤ کا سفر کرتے رہیں گے۔(ماخوذ از حیات سلیمانی،ص:۵۱۵)

سید صاحب کی اس تشریف آوری کے سلسلہ میں ایک تاریخی حقیقت یہ ہے کہ دراصل سید صاحب کو ریاست حیدرآباد میں صدر الصدور کے عہد کے لئے بلایا جارہا تھا لیکن سید صاحب کو اس عہدہ میں کوئی کشش نظر نہیں آئی لیکن جب ریاست بھوپال کے لئے قضاء وتعلیمات کے سلسلے میں آپ سے نواب حمید اللہ خاں نے فرمائش کی تو اس کو قبول فرمالیا۔ جناب علامہ محمد صاحب تحریر فرماتے ہیں۔نواب صاحب کے ایک خط کو تذکرہ سلیمان میں یوں نقل کیا گیا ہے۔

''میں نے اپنی ریاست کے دارالقضاء اور یہاں کے مدارس عربیہ کی اصلاح کا عزم کیا اور اس کام کے لئے میری نظر میں علامہ سید سلیمان ندوی سے موزوں شخصیت کوئی نہیں تھی۔لیکن میری دعوت کو آپ قبول نہیں فرماتے ہیں۔اب میں بریٔ الذمہ ہوں،اگر اللہ تعالیٰ قیامت میں مجھ سے اس بارے میں پوچھے گا تو صاف عرض کردوں گا کہ بارالٰہا میں نے اس کام کے لئے جس شخصیت کو موزوں سمجھا۔بہ اصرار اس کو بلانا چاہا مگر میرا اصرار کارگر نہ ہوا۔'' (تذکرۂ سلیمان،ص:۲۰)

سید صاحب کی بھوپال آمد پر اخبار ندیم بھوپال نے باقاعدہ اپنے شمارہ ۱۹ر جولائی ۱۹۴۶ء میں یہ تاثرات پیش کئے:

''یہ بھوپال اور اہل بھوپال کی خوش قسمتی ہے کہ علامہ موصوف جیسا فاضل اجل بھوپال کی مسند قضا اور جامعہ احمدیہ کے عہدہ امارت کو زینت بخش رہا ہے۔''

سید صاحب۔بھوپال آتو گئے تھے۔لیکن لکھنؤ اور اعظم گڑھ کی فضا اور ماحول کے مقابلہ میں بھوپال کی سرکاری رہائشگاہوں کی پرکیف ہوا انہیں سکون واطمینان نہیں بخش سکی، اکثر شبلی منزل کے سکون کو یاد کرتے ان کا ارادہ مدلولین کے علمی معیار کو بلند کرنا تھا۔وہ یہاں ایک دارالتکمیل بھی قائم کرنا چاہتے تھے۔ماہانہ علمی رسالہ نکالنے کی بھی تجویز تھی۔ایک ادارہ نشرواشاعت بھی یہاں انہوں نے قائم کردیا تھا اور بھی بہت کچھ کرنے کا ان کا ارادہ تھا۔لیکن سید صاحب۔زیادہ دنوں یہاں نہیں رکے اور صرف چار سال کے مختصر قیام کے بعد واپس ہوگئے۔۱۹۴۷ء میں آزادی ہند کا انعام اور فسادات کی دہشت ہر ہندوستانی پر طاری رہی۔غالباً سید صاحب پر بھی ان ہولناک واقعات کا اثر ہوا ہوگا اور پھر یہ دیکھ کر کہ سرکاری سرپرستی اور تعاون اب چند روز کا ہے اس کے بعد ان کی دینی،تعلیمی اور اصلاحی اداروں سے وابستگی کا کیا حشر ہوگا۔مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا مسعود عالم ندوی کے نام سید صاحب کے تحریر کردہ خطوط سے کچھ ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے۔سید صاحب بھوپال سے یکم جون ۱۹۵۰ء کو ہمیشہ کے لئے رخصت ہوئے۔

دارالعلوم تاج المساجد،بھوپال

سید صاحبؒ کے دوران قیام جب ریاست کے تمام دینی

مدارس و جامعات ختم کردیئے گئے تھے۔مولانا محمد عمران خاں ندویؒ نے ویران اور نامکمل تاج المساجد میں ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی خود سید صاحب کے مبارک ہاتھوں اس کا افتتاح ہوا، مولانا محمد عمران خاں ندوی بیان کرتے ہیں:

''قضاوقدر کا یہ فیصلہ بھی ہم وابستگان دارالعلوم کے لئے کس قدر قابل فخر، لائق شکر. اور تاریخی ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی اس وقت بھوپال میں موجود تھے جس وقت دارالعلوم تاج المساجد قائم ہوا اور موسس دارالعلوم نے انہیں کے علم ودانائی اور حکمت سے لبریز ہاتھوں سے اس سرچشمہ علم و دین کا افتتاح کرایا۔(نشان منزل خاص نمبر جنوری ۱۹۷۵ء)

کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس:

سید صاحب کے قیام بھوپال کے زمانہ میں ہی بھوپال میں ۲۵،تا ۲۸ جنوری ۱۹۴۹ء کل ہند ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقد ہوئی اس کا افتتاح سید صاحب نے ہی فرمایا۔ مشہور ادیب کرشن چندر کی فرمائش پر سید صاحب اسٹیج پر تشریف لائے اور حاضرین کو اس طرح خطاب کیا:

''زبان وقلم اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔یہ نعمت جس کو ملی ہے حق ہے کہ وہ اس کی قدر کرے اور اس قوت کو وہ ان کاموں میں صرف کرے جن سے مخلوقات الٰہی کو فائدہ پہونچے جن سے سچائی ابھرے اور جھوٹ نیچے ہو جن سے نیکی پروان چڑھے اور بدی نیست ہو۔''

(ماخوذ از فار خاص نمبر بھوپال:۱۹۶۹ء)

اس کانفرنس میں سید صاحب نے اپنا مقالہ ''قومی زبان'' موضوع پر پڑھا۔جس میں آپ نے ظاہر کیا تھا، کہ اردو اس دیش میں ہندو، مسلمانوں کے خوشگوار تعلقات سے پیدا ہوئی، پروان چڑھی اور ادب وفن کے معیار کو پہونچی۔اس کانفرنس میں بنفس نفیس شرکت کو ہر طبقہ علم وادب نے سراہا اور ایک عرصہ تک ملک کے اخبا وجرائد میں سید صاحب کی وسعت قلبی وروشن خیالی کے چرچے ہوتے رہے۔اس کانفرنس کے اختتام کے فوراً بعد ۳۰ر جنوری ۱۹۴۹ء کو مشہور شاعر جوش ملیح آبادی نے اپنی ایک طحدانہ نظم بھوپال میں کسی مجلس میں پڑھی جس میں بڑی جسارت کے ساتھ خالق کائنات کے وجود وقدرت پر سوال قائم کیا گیا تھا۔اس کا پہلا شعر تھا۔

جبکہ بچے خواب کے ہنگام تھے گرم خروش
باپ کی صرف ایک ہوں گئے، کردیا سب کو خموش

ایسے ہی اور اشعار میں ظاہر کیا گیا تھا کہ کہ دنیا کی تاریخ میں جو مظالم ہوئے ہیں ان کو آسمانی باپ نے روکنے کے لئے کیا کیا۔یہ نظم روزنامہ ''ندیم'' کے شمارہ ۳۱ر جنوری ۱۹۴۹ء میں شائع بھی ہوئی۔سید صاحب اس نظم کو پڑھ کر مضطرب ہوئے اور جوش ہی کے لہجہ وانداز میں اس کا برجستہ جواب دیا۔سید صاحب کی جوابی نظم ۲ر فروری ۱۹۴۹ء کے ندیم میں شائع ہوئی بعد میں ملک کے مختلف جرائد نے بڑے اہتمام سے اس کو شائع کیا۔

حضرت تھانویؒ

سید صاحب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے آخر میں بیعت ہو گئے تھے۔بھوپال کے بعد اسفار سید صاحب نے اپنے پیر ومرشد کے امر وایماء سے کئے اور خود حضرت تھانوی نے ریاست بھوپال کے حکمرانوں کے لئے ان کی دینی خدمات پر دعائے خیر فرمائی۔یہ بھی تاریخی اتفاق ہے کہ حضرت تھانوی نے جب ۱۹ر جولائی ۱۹۴۳ء کو وفات پائی اس وقت سید صاحب بھوپال میں مقیم تھے۔''یادرفتگاں'' میں سید صاحب خود تحریر فرماتے ہیں:

''خاکسار اب تک بھوپال میں تھا۔عنات الٰہی دیکھئے کہ عین شب وصال کو خواب دیکھا کہ مولانا .....علی صاحب مجھ سے فرمارہے ہیں کہ حضرت مولانا کو نوری صحت ہو

گئی ہے۔ صبح اٹھ کر میں نے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب سے یہ خواب بیان کیا۔ وہ چپ رہے مفتی صاحب ۲۱ر جولائی اور خاکسار ۲۲ر جولائی کو بھوپال سے (تھانہ بھون کے لئے) روانہ ہوئے۔''

خانقاہ مجددیہ

بھوپال میں خانقاہ مجددیہ جو حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے خاندان کے چشم و چراغ حضرت شاہ رؤف احمد صاحب مجددی کی ایجاد و آباد کردہ خانقاہ ہے۔ سید صاحب قیام بھوپال کے دوران اس خانقاہ میں حاضر ہوتے اور روحانی فیض حاصل کرتے، اس وقت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی عرف نیر نئے میاں کے دم خم اور سوز نفس سے یہ معرفت گاہ معمور تھی۔ ایک زمانہ میں جب شاہ محمد یعقوب صاحب بہت چھوٹے تھے ان کے والد شاہ ابواحمد صاحب کی وفات پر سید سلیمان ندویؒ کے بڑے بھائی..... سید ابوحبیب صاحب کو خانقاہ کی زمام کار سپرد بھی کی گئی تھی۔ بعد میں نیر نئے صاحب کو سن رشد تک پہونچنے پر خرقہ خلافت سے انہیں کو نوازا گیا۔ اور اب نیر نئے میاں صاحب کی وفات کے بعد سے حضرت مولانا محمد سعید صاحب مجددی اس خانقاہ کے امین و زعیم ہیں۔ خود میر سعید صاحب نے ایک مرتبہ جواب دیا تھا کہ میں نہ ندوی ہوں نہ قاسمی لیکن ہم نے عربی علامہ سلیمان ندویؒ سے پڑھی ہے۔ میر سعید صاحب ماشاء اللہ عربی نثر لکھتے اور بولتے ہی نہیں بلکہ عربی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کی بعض عربی نظمیں سرکاری جامعات کے کورس میں شامل ہیں۔

تبلیغی جماعت:

علامہ سید سلیمان ندوی جب بھوپال میں مقیم تھے۔ یہاں ان کے شاگرد رشید مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری نے دعوت و تبلیغ کا کام شروع کر دیا تھا۔ سید صاحب اس سے بہت مانوس ہوئے اور تبلیغی کاموں میں شرکت کرتے رہے۔ پروفیسر عبدالقوی دیسنوی تحریر فرماتے ہیں:

''تبلیغی مصروفیات اور دوسرے دینی کاموں کی وجہ سے بھوپال میں سید صاحب کچھ سکون محسوس کرنے لگے تھے۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک مکتوب میں اس طرح کیا تھا ''یہاں بھی بفضل الٰہی کچھ دینی کام انجام پا رہے ہیں، ورنہ یہاں کا قیام اجیرن ہو جاتا۔'' ۱۴ر جنوری ۱۹۴۹ء کو بنام مولانا مسعود عالم ندویؒ اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''آج کل سال دو سال سے مولوی محمد عمران صاحب نے یہاں تبلیغی جماعت کا کام شروع کیا ہے جو کامیاب ہو رہا ہے کل مع اپنی جماعت کے بمبئی گئے ہیں۔'' (از سلیمان، ص:۴۷۳)

علامہ سید سلیمان ندوی ۱۶ر جولائی ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۳ء تک ریاست بھوپال کے قاضی القضاۃ بھی رہے، اب مسند قضا پر فائز رہ کر زیادہ تر اس بات کی کوشش فرماتے تھے کہ فریقین کے درمیان صلح و صفائی ہو جائے اور ہار جیت کے فیصلہ سے بدمزگی نہ ہو۔ ایک مقدمہ میں عبرت ناک واقعہ پیش آیا، فریقین اپنے اپنے موقف اور بیانات پر مصر رہے۔ سید صاحب نے پیش کار کو حکم دیا کہ دونوں کو مسجد لے جائیں اور قرآن ہاتھ میں دے کر بیانات لے لیں۔ اس مذہبی پابندی کے باوجود فریقین سابقہ بیانوں پر اڑے رہے۔ اللہ کا حکم یہ ہوا کہ جب مسجد سے باہر آئے تو جس نے غلط بیانی سے کام لیا تھا اس کی ناک سے خون جاری ہو گیا اور وہ وہیں جاں بحق ہو گیا۔ اس انجام سے شہر کا ہر فرد سکتہ میں آ گیا۔

بزم سلیمان:

علامہ سید سلیمان ندوی اور بھوپال کے تعلق سے ایک قابل ذکر واقعہ یہ بھی ہے کہ سید صاحب کی صد سالہ برسی پر تقریبات کا حسن اختتام..... (بقیہ صفحہ ۳۷ر پر)

احمد علی حسنی ندوی
مدیر سہ ماہی تعمیر افکار، دارِ عرفات، رائے بریلی

مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ

اور

بھوپال سے ان کے روابط

جب مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو مغربی تہذیب وتمدن نے سر اٹھار کھا تھا اور مسلمانوں کی شکست خوردہ زندگی اوران کی بے عملی نے ان کو بہت متاثر کیا لیکن ان کے سامنے مسلمانوں کا شاندار ماضی تھا اس کی سیاسی تمدنی زندگی تھی، ان کے سامنے حضرت مجدد الف ثانی کے کارنامے تھے، اور حضرت شاہ ولی اللہ کی دینی، تعلیمی اور مصلحانہ کام تھا اور حضرت سید احمد شہید کی دینی، عملی اور سربلندی کی تحریک تھی، اس صورت حال نے مولانا کے دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، پھر انہوں نے اپنے عملی زندگی کو اپنی عملی روشنی میں اس راستے پر اپنے کو ڈالنے کی کوشش کی جس سے وہ ایسی تبدیلی لاسکیں جس سے افکار روشن اور تابناک ماضی اور پس ماندہ زندگی پر اثر انداز ہو، مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی کی کتاب ''سوانح مفکر اسلام'' پر مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی مرحوم نے اپنے پیش لفظ میں مولانا کی پوری زندگی کا خلاصہ بیان کردیا ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے سامنے اسلامی ہندوستان کا ایک ایک صفحہ کھلا ہوا ہے، اللہ کے یہاں بندے کا کیا درجہ تھا اس کا فیصلہ ہم میں سے کوئی نہیں کرسکتا لیکن اس صدی کے ایک نادر فرد کو جانتا ہوں جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے اور برملا کہا جاسکتا ہے کہ یعرفہ البیت والحل والحرم اور جس سے اللہ تعالیٰ نے اس طرح کا کام لیا ہے جس طرح ان کے پیش رو سلف الصلاحین سے لیا تھا، وہ شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی کی ہے جن کے لئے ہم بڑے بڑے القاب تجویز کرسکتے ہیں مگر یہ ہماری زبان نہیں ہے، مولانا کی زندگی میں ان کی سیرت پر عربی اور دوسری زبانوں میں اتنے مضامین شائع ہوئے ہیں جن کو یکجا کرنے کے لئے کافی وقت درکار ہے، خود آپ نے اپنے قلم سے خودنوشت سوانح سات جلدوں میں تحریر فرمائی ہے''۔ (پیش لفظ مفکر اسلام)

اسی کتاب کے مقدمہ میں مخدوم ومحترم مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی مدظلہ العالی نے مولانا کی فکر، دینی اور دعوتی جدوجہد کا بہترین خلاصہ پیش کیا ہے جس کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مولاناؒ نے اپنی فکری ودعوتی جدوجہد میں حاضر کی فنکارانہ اور مختلف الجہات زندگی کے پہلوؤں کو سامنے رکھا اور اس کے لئے موزوں حکمت عملی اختیار کی، مولانا نے اصحاب اقتدار وسطوت سے مخاطبت میں حضرت مجدد الف ثانی کا طریقہ اپنانے کی کوشش کی، تعلیم وتربیت کے محاذ پر شاہ ولی اللہ دہلوی کی تفہیم وتشریح کا اسلوب اختیار کیا اور فکر ودانش کے میدان میں مذکورہ بالا دونوں میں دین کے طریقہ فکر کے ساتھ

قدماء میں ابن تیمہ وابن قیم اورابن جوزی کا طریقۂ تحقیق اور تفہیم کو اختیار کرنے کی کوشش کی اور امت کی اصلاح اور اس کی سربلندی کی راہ اختیار کرنے کے لئے حضرت سید احمد شہید اوران کی جماعت ومصلحین کے اسلوب واصلاح کو اپنایا، مولانا نے اپنے عہد کے مولانا الیاس کاندھلوی کے اختیار کردہ طریقہ دعوت واصلاح کو قدر کی نظر سے دیکھا اوراس کے ساتھ وابستگی بھی اختیار کی نیز اپنے عہد کے دوسری کوششوں کے مفید پہلوؤں کو بھی سراہا، اس طرح مولاناؒ نے امت کی اصلاح وترقی کے لئے ہمہ جہت فکر وعمل اختیار کیا"۔

بھوپال کی شخصیات سے مولانا کا تعلق سب سے پہلے جس شخصیت سے ظاہر ہوتا ہے وہ نواب سید صدیق خاں قنوجی ثم بھوپالی کی ہے، جس کا مولانا نے ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ:

"بدوشعور سے جونام کانوں میں احترام وعظمت کے ساتھ پڑے ان میں ایک نام امیر الملک والاجاہ نواب سید صدیق حسن خاں بہادر کا تھا بہت سے علمی ودینی خاندانوں کے بچوں کے برخلاف اس سن میں میرے اس نام سے مانوس اوران کے بہت سے حالات وکمالات سے واقف ہونے کی وجہ سے اولاً تو وہ روحانی اور مسلکی تعلق تھا، جونواب صاحب اوران کے خاندانوں کا حضرت سید احمد شہیدؒ سے تھا، ان کے والد ماجد مولانا سید اولاد حسن قنوجی سید صاحب کے ممتاز خلفاء اور معتمدین میں تھے، سید صاحب کو سید برادر یا سید بھائی کہتے تھے، اور صوبۂ سرحد کی اہم سفارتوں پر جن میں بعض والیان ریاست سے گفتگو اور مراسلت مقصود ہوتی تھی ان کا انتخاب فرماتے تھے"۔

مولانا آگے دوسری وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس صغرسنی میں اس نامور اور باکمال شخصیت سے واقفیت کی دوسری وجہ جن کی وفات میری ولادت سے برسوں پہلے اور جن کی سکونت میرے وطن سے سیکڑوں میل دور تھی ان کا بھوپال سے پہلے ٹونک میں جہاں ہمارے خاندان کی ایک اہم شاخ مقیم تھی، طویل قیام اور پھر متعدد خاندانی قرابتیں تھیں، جن کی وجہ سے خاندانوں کے بزرگوں کی مجلسوں میں ان کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا"۔

مولانا تیسری وجہ یہ بیان کرتے ہیں:

"تیسری بڑی وجہ یہ تھی کہ والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کی وفات کے بعد جن کے نواب صاحب کے بڑے فرزند رضی الدولہ ونواب سید نورالحسن خاں مرحوم سے حددرجہ کے مخلصانہ اور برادرانہ تعلقات تھے، میں اپنے برادر بزرگ مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالحی صاحب مرحوم ناظم ندوۃ العلماء کے ساتھ جو میڈیکل کالج لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے، کئی سال نواب صاحب کی کوٹھی بھوپال ہاؤس گھسیاری منڈی لکھنؤ میں گھر کے بچوں کی طرح رہا، اور قدرتاً نواب صاحب کے تذکرے اور بھوپال کے عہد رفتہ کے واقعات کانوں میں پڑتے رہے، اور محض حافظہ میں محفوظ ہی نہیں جسم وجاں میں پیوست ہوتے رہے۔

شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے ان اسباب ووجوہات کے علاوہ ان کی تصانیف اور علمی کمالات سے استفادہ اور تاثر کا بھی خصوصیت سے ذکر کیا ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ جب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کررہے تھے تو یہ دور نظامت بھوپال کی ہی شخصیت نواب سید علی حسن خاں صاحب مرحوم کا تھا جونواب سید صدیق حسن خاں صاحب کے دوسرے فرزند تھے، بھوپال ہاؤس لکھنؤ میں قیام کا تذکرہ مولانا نے اپنی کتابوں "حیات عبد الحی" "پرانے چراغ"، اور "کاروان زندگی" میں دل کھول

کر کیا ہے، اس کا ایک فائدہ ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''اس کوٹھی میں رہنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ آنکھوں کے زنگار چھٹ گئے، اور دولت وامارت سے کبھی آنکھیں خیرہ نہیں ہوئیں اس لئے کہ اس کا اعلیٰ سے اعلیٰ مظہر اس کوٹھی میں دیکھ لیا، میرے سامنے ہی ایک مرتبہ بیگم صاحبہ بھوپال نواب سلطان جہاں یہاں آئیں اور ہم بچوں کے سر پر ہاتھ رکھا۔''

(کاروان زندگی اول صفحہ ۸۶)، اس وقت مولانا کی عمر ۱۰/۱۱ سال سے زیادہ نہ تھی۔

بھوپال سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا دوسرا گہرا تعلق ان کے استاد خاص شیخ جلیل عرب صاحب کے توسط سے ہے جن سے مولانا نے بہت کچھ استفادہ کیا، اور علم وادب میں وہ کمال پیدا کیا کہ اساطین علم وادب نے ان کے سامنے سر تسلیم خم کیا، اور عرب وعجم میں امارت کا درجہ حاصل کیا، مولانا اپنے ان استاد کے مرہون منت رہے، ان کے یہ محسن استاد ان کے والد عبدالحی حسنی کے استاد شیخ حسین بن محسن الانصاری الیمانی ثم بھوپالی کے پوتے تھے ان استاد کے سپرد کرنے والے مولانا ہی کے بڑے بھائی مولانا ڈاکٹر سید عبدالحی حسنی تھے۔

مولانا کہتے ہیں:

''عربی کے لئے اپنے ایک دوست اور عربی زبان کے بے مثال استاد شیخ خلیل بن محمد بن حسین یمنی بھوپالی کے سپرد کیا، یہ خاندان دو پشتوں سے ہمارے خاندان کا استاد چلا آرہا ہے، میرے والد صاحب ان کے دادا علامہ حسین ابن محسن الانصاری کے حدیث میں اور ان کے والد شیخ محمد کے ادب میں شاگرد تھے''۔ (کاروان زندگی اول صفحہ ۸۸)

خلیل عرب صاحب کی امتیازی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا نے جو لکھا ہے اس سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ مولانا کی شخصیت سازی میں ان کا کیا حصہ رہا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''اپنے ذوق ونظر کو اپنے طلبہ تک منتقل کردینے اور ان کے رگ وریشہ میں اتار دینے کی عجیب وغریب قابلیت، ذرا اس کتاب میں جان ڈال دینے، فن کا صحیح ذوق پیدا کردینے اور مصنف کا ہم زبان اور ہم مذاق بنادینے کی ان میں وہ بے نظیر قدرت تھی جو ہزاروں میں کہیں کسی ایک استاد اور ماہر فن میں ہوتی ہے، یہ قابلیت کسبی نہیں بلکہ وہبی ہے،.....عربی زبان وادب کا ذوق سلیم وذوق صحیح پھر اس ذوق کے منتقل کرنے کی وہ قابلیت جو عرب صاحب میں دیکھی وہ نہ صرف ہندوستان جو صدیوں سے عربی کے مذاق سلیم سے ناآشنا اور صحیح طریقۂ تعلیم سے محروم ہے بلکہ ممالک عربیہ کے اعلیٰ وعربی حلقوں میں شاذ ونادر ہی شاید پائی جائے''۔ (کاروان زندگی اول صفحہ ۹۱)

یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ شیخ خلیل عرب صاحب مولانا کے استاد تھے اور ان کے چھوٹے بھائی حسین عرب صاحب مولانا کے ہم سبق اور ساتھی تھے، عرب خاندان کے افراد مثلاً عرب صاحب وغیرہ سے بھی مولانا کے دوستانہ مراسم تھے، اور اس خاندان کو مولانا سے آج بھی خصوصی تعلق ہے، جسے عطیہ خلیل عرب صاحبہ جو ایک بڑی فاضلہ خاتون ہیں، اسی طرح اور بھی حضرات، خلیل عرب صاحب مولانا کی تربیت کا بھی بڑا خیال فرماتے، ایک مرتبہ محض ایک شبہ کی بنا پر سکت تادیب فرمائی اور پٹائی کی، جس پر مولانا نے کوئی صفائی نہیں دی اور پوری سعادت مندی سے اس کو قبول کیا، اسے مولانا محض توفیق الٰہی قرار دیتے ہوئے فرماتے تھے کہ اس چیز نے مستقبل میں میرے لئے عربی زبان وادب کا ذوق پیدا ہونے اور اس کے ذریعہ سے دین وعلم کی خدمت کرانے کا فیصلہ کرادیا۔ (کاروان زندگی اول صفحہ ۹۲)

تیسرا اہم تعلق حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالی کے

توسط سے رہا جن کی مولانا پر بڑی عنایت تھی اور مولانا کو بھی ان سے حد درجہ مناسبت تھی، اپنے مربیون حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری، حضرت مولانا احمد لاہوری اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا رقمطراز ہیں:

''شیخ الحدیث کے ماسوا مشائخ عصر میں سے سب سے زیادہ ذہنی مناسبت بھوپال کے حکیم وعارف شیخ حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی سے تھی، بھوپال کے سالانہ تبلیغی اجتماع کے سلسلہ سے راقم سطور قریب قریب ہر سال بھوپال حاضر ہوتا تھا، خاندان اور سلسلہ کے روابط مزید برآں رفیق قدیم مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب کے حضرت سے خصوصی ربط وتعلق کی بنا پر حضرت کے یہاں حاضری دینی شروع کی، حضرت کی بہت جلد توجہ خاص ہوگئی، اجتماع کے موقعہ پر خاص طور پر مجھے دریافت فرماتے، اور میری آنکھ آمد کا انتظار فرماتے، دل رابہ دل رہیست، مجھے بھی حضرت کے ارشادات وملفوظات میں تصوف واحسان کے لطیف نکتوں، نادر تحقیقات کے ماسوا بھی، زندگی کے عمیق مطالعہ، مسلمانوں کے مختلف طبقوں سے گہری واقفیت اوران کی کمزوریوں اور مغالطوں کی نشاندہی، اصلاح باطن کی ضرورت کو اس زمانہ کے طبائع واذواق کے مطابق بیان کرنے اوراس کو ایک بدیہی حقیقت اورضرورت ثابت کرنے، شکستہ دلوں کی تسکین، اور مثالوں اور چھوٹی چھوٹی حکایتوں کے پیرایہ میں عمیق ودقیق حقائق کو بیان کردینے کا ایسا خداداد ملکہ اور کمال اوراس کے ایسے دل آویز نمونے نظر آئے جن کی مثال کم سے کم اس دور مادیت اور سمیت میں نہیں دیکھی، 'وفوق کل ذی علم علیم'۔

(کاروان زندگی اول صفحہ ۴۴۳)

مولانا علی میاں صاحبؒ نے اس مجالس کو قلمبند کرنے کا بھی سلسلہ شروع کیا، اور ''صحبتے با اہل دل'' کے نام سے ایک قیمتی مجموعہ تیار کردیا۔

یہ ملفوظات ''صحبتے با اہل دل'' کے نام سے حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے مقدمہ کے ساتھ ان ہی کے اشاعتی ادارے مکتبہ الفرقان سے شائع ہوئے، یہ مجموعہ ملفوظات ۳۰ روح پرور، ایمان افروز، عمل پر ابھارنے والی مجالس پر مشتمل ہے، تیسویں مجلس گرچہ خواہرزادے مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کی مرتب کردہ ہے لیکن کتاب کی ترتیب کے اعتبار سے مصنف کی ہی ترتیب دی ہوئی ہے، پہلی مجلس ۳ رذی الحجہ ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۰ مارچ ۱۹۶۵ء کی ہے، جبکہ آخری مجلس ۲۷ رمحرم الحرام ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۰ راپریل ۱۹۷۰ء کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجالس یا ملفوظات کسی ایک سفر یا زمانے کے نہیں ہیں بلکہ چار سالوں پر محیط ہیں، ان ملفوظات کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ صاحب ملفوظات کی نظر سے بھی یہ گزرے ہیں کہ اس کی پہلی قسط محرم الحرام ۱۳۸۳ھ کے الفرقان کے شمارہ میں شائع ہوگئی تھی اور ۲۱ رقسطیں اس شمارہ میں صاحب ملفوظات کے سامنے آگئی تھیں، مرتب ملفوظات نے یہ بھی اہتمام کیا کہ ہر ملفوظ پر ایک عنوان قائم کیا جس کے مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں کہ جس سے اس کے مقصد اور روح کی طرف رہنمائی ہوجائے۔

حضرت شاہ یعقوب صاحب مجددی کو اللہ تعالیٰ نے اپنے مشائخ اور علماء مین جو امتیاز اور خصوصیت عطا فرمائی تھی اس کو مولانا منظور نعمانی نے یوں بیان کیا ہے:

''محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان قلب کو وہ دولت عطا فرمائی جس کے بارے میں قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے: ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا' جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمت کی نعمت ملی اس کو خیرا کثیرا عطا فرمایا گیا،

اور مولانا علی میاں ندوی نے ایک جملہ میں ان کی عالی مرتبتی کو اس طرح ظاہر فرمایا کہ علماء اور مشائخ اور اہل دین کے طبقت میں اپنے طویل سفروں کے اور وسیع معلومات کے باوجود مصنف نے (یعنی مولانا ابوالحسن علی ندوی) مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی اور شاہ محمد یعقوب مجددی صرف مولانا علی میاں کو خصوصی استفادہ اور مراسلت کے مواقع امتیازی حیثیت سے حاصل ہے جس کا اعتراف مولانا منظور نعمانی نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

رفیق محترم مولانا علی میاں کے بھوپال سے کچھ خصوصی روابط بھی تھے اور وہاں ان کی آمد و رفت تبلیغی اجتماع کے علاوہ بھی ہوتی تھی، اس لئے حضرت کی مجالس میں حاضری کا ان کو زیادہ موقع ملتا تھا، حضرت کو ان کے ساتھ خاص تلعق تھا۔ (صحبتے با اہل دل صفحہ ۱۲)

حضرت مولانا علی میاں کی شخصیت سازی میں بھوپال کا جو حصہ رہا ہے اس میں اگر بھوپال کی شخصیات کا جائزہ لیا جائے تو حضرت یعقوب مجددی کی شخصیت ان کی شخصیت میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔

بھوپال کا فیض ایک دوسرے واسطے سے بھی نظر آتا ہے یہ واسطہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی کا ہے حضرت مولانا عبد الشکور صاحب فاروقیؒ سے قدیم روحانی اور خاندانی تعلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے سرگذشت حیات کاروان زندگی حصہ اول صفحہ ۴۴۶ میں لکھا ہے کہ مجھے خاص طور پر ان کی جس ادا نے فریفتہ کیا، اور ان کا معتقد بنایا وہ اوّلاً ان کی سادگی، تواضع، بے نفسی تھی، دوسرے ان کا حقانی و ربانی وعظ جو علمائے سلف کی طرح ہر طرح کی لفاظی اور تصنع سے پاک، عقائد کی اصلاح، فرائض کی پابندی اور تذکیر بالآخرۃ پر مشتمل ہوتا تھا، مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی بھوپال کے عظیم شیخ و مربی اور عارف کامل حضرت پیر ابواحمد مجددی کے مرید اور خلیفہ اور بقول مولانا عبد منظور نعمانی کے کہ "وہ عالی مقام خلیفہ تھے" شاہ پیر ابواحمد کے متعلق مولانا علی میاں کا تاثر ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ پیر ابواحمد اپنے عہد کے مشائخ کبار میں سے تھے اور اس خیر دور میں کم سے کم ہندوستان میں نسبت مجددیہ کا ان سے بڑھ کر مظہر اور اس طریقہ کمالات و علوم اور معارف و حقائق کا ان سے بڑھ کر عارف و ترجمان نظر نہیں آیا، وہ غایت درجہ کے سنت کے متبع اور آداب طریقت کے امین و محافظ تھے۔ (صحبتے با اہل دل صفحہ ۳)

شاہ ابواحمد بھوپالی کے دادا شاہ رؤف احمد صاحب بھوپالی حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے شاگرد اور حضرت شاہ غلام علی دہلوی کے خلیفہ تھے، بقول مولانا علی میاں کے حضرت شاہ غلام علی کو جن چند خلفاء پر فخر تھا ان سے وہ بھی ہیں۔

مولانا علی میاں نے ان کی مرجعیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بھوپال میں رجوع عام ہوا اور علماء و خواص کا بھی ایک بڑا ایک گروہ دست گرفتہ کا اور حلقہ بگوش ہوا۔ افغانستان اور بخارا سے لوگوں نے آکر اکتساب فیض کیا اور بلخار اور یار قند سے طالبین آکر مجاز اور خلافت سے سرفراز ہوئے۔ (صحبتے با اہل دل صفحہ ۲۷)

روحانی و باطنی استفادہ کے علاوہ علمی و ادبی استفادہ میں بھی مولانا ابوالحسن علی ندوی بھاپال کے خوشہ چیں نظر آتے ہیں گو انہیں اس کے لئے بھوپال میں طرح اقامت نہیں ڈالنی پڑی، مگر ان کے استاد حدیث مولانا حسن خاں ٹونکی اور ان کے والد حکیم عبدالحی سید عبدالحی حسنی نے بھوپال جاکر مسند حدیث پر جلوہ افروز یمنی نژاد عالم و محدث شیخ حسین ابن محسن انصاری الخزرجی الیمانی سے حدیث میں خصوصی استفادہ حاصل

کیااور اجازت حاصل کی اس واسطے سے مولانا علی میاں ندوی نے حدیث کی اجازتیں عرب وعجم کے علماء اور مشائخ اور طلباء کو دیں، یہاں پر ہم صرف ۳ ناموں پر اکتفا کریں گے ایک شام کے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ اور دوسرے ہندوستان کے مایہ ناز محدث مولانا محمد یونس جونپوری شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور اور تیسرا نام حضرت مولانا رابع صاحب ندوی کا ہے، جن کے ذریعہ سے مولانا کے دوسرے فیوض کی طرح یہ فیض بھی عالم گیر ہوا۔

مولانا کا بھوپال سے تعلق ایک گونہ نہ تھا، یہ تعلق ہمہ جہتی نظر آتا ہے، مولانا کے خاندان کی ایک شاخ بھوپال میں مقیم ہوگئی تھی جس میں خصوصیت سے حضرت مولانا خواجہ احمد نصیر آبادی کی اولاد قابل ذکر ہے، حضرت خواجہ احمد نصیر آبادی مولانا علی میاں کے دادا مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی کے حقیقی پھوپھا اور شیخ ومرشد تھے، خاندان کے اور بھی حضرات بھوپال کے اشخاص میں مولانا محمد عمران خان صاحب ندوی مرحوم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، جنہوں نے نہایت مخلصانہ تعاون مولانا کو ہر موڑ پر دیا اور ان کے اس تعلق کا ان کے افراد خاندان خصوصا ان کے سب ہی بھائیوں مولانا نعمان خاں ندوی، مولانا سلمان خاں ندوی اور مولانا عرفان خاں ندوی، مولانا لقمان خاں ندوی اور اسی طرح ان کی اولاد واخلاف نے بڑا ہی خیال اور پاس رکھا، اللہ ان سب کو جزاء خیر دے اور ان کے طرز عمل میں نئی نسل کے لوگوں کے لئے نصیحت کا سامان فراہم کرے۔

مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی کے ساتھ مولانا کا متعدد امور میں اشتراک عمل بھی رہا، جس کا مولانا نے یوں ذکر کا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''مولانا محمد عمران خاں صاحب نے اہتمام کا چارج لیا ہم دونوں میں اپنے اپنے دائرہ کار میں پورا تعاون تھا وہ میرے علمی وتدریسی منصوبوں میں پوری مدد کرتے تھے، اور میں ان کو بحیثیت مہتمم دارالعلوم پورا تعاون دیتا تھا، ہمارے اشتراک عمل اور باہمی اعتماد واحترام نے دارالعلوم میں بھی انتظامی واخلاقی فضا پیدا کردی، اور کاموں میں زیادہ مستعدی وسرگرمی نظر آنے لگی۔ (کاروان زندگی اول صفحہ ۱۹۷)''

مولانا علی میاں ندوی نے جس اشتراک عمل اور باہمی اعتماد واحترام کا ذکر کیا ہے وہ اگرچہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے پس منظر میں ہے مولانا عمران خاں صاحب کے بھوپال میں یکسو ہوجانے اور دارالعلوم تاج المساجد کی تعمیر وترقی میں منہمک ہوجانے کے بعد بھی ان دونوں دوستوں کا یہ ربط وتعلق برقرار رہا، اور دونوں ایک دوسرے کے کاموں میں مشیر ومعاون رہے، اور آج بھی جب کہ یہ دونوں شخصیتیں ہمارے اور آپ کے بیچ نہیں ہیں لیکن دونوں اداروں کے ذمہ داروں اور متعلقین کے مابین یہ ربط وتعلق برقرار ہے، اور دارالعلوم تاج المساجد کے موجودہ سربراہ مولانا محمد سعید میاں مجددی جنہیں مولانا علی میاں ایک محبوب اور محسن کی شخصیت حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی کے فرزند وجانشین ہونے کی نسبت حاصل ہے کی عنایات مولانا علی میاں کے افراد خاندان اور ندوۃ العلماء کے متعلقین کو حاصل ہی، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ذمہ دار حضرات خصوصا حضرت مولانا علی میاںؒ کے بھانجے اور جانشیں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا دارالعلوم تاج المساجد اور بھوپال کے علمی ودینی اور ادبی اداروں سے مخلصانہ، محبانہ اور سرپرستانہ تعلق ہے، اور اہل بھوپال دوسرے علمی وادبی شہروں کے مقابلہ اس میں پیچھے نہیں بلکہ آگے آگے نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس خصوصیت کو باقی رکھے اور اس میں ترقی دے۔ آمین

□□□

اسلام، تصوف اور ادب

ایک علمی تجزیاتی مطالعہ

○ سید مسعود الحسن لکچرر زبان وادب اردو ریجنل انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن، بھوپال

جہاں تک اسلامی تعلیمات اور تصوف کا تعلق ہے علمی نقطہ نظر سے آج یہ بات مانی جا چکی ہے کہ اسلامی عقائد اور تصورات ہی تصوف کی اصل ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں ہم اسے سلوک، تقویٰ اور پرہیز گاری اور اخلاق محمدیؐ کی شکل میں جانتے ہیں، کتاب اور سنت ہی اس کا اصل منبع ہے، قرآن میں ہمارے نبیؐ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اے نبی ہم نے آپ کو تمام عالموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ ۔ صوفیہ کی انتہائی شان ہمیں حضور کی ذات گرامی، اصحاب صفہ، صحابہ کرام اور تابعین کی شکل میں اسلامی تاریخ میں جا بجا نظر آتی ہے۔

صوفیہ اور اہل اللہ قرآنی آیت اشد حبا للہ، یعنی جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کے ساتھ سخت محبت رکھتے ہیں کے اصول پر عامل نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کا بہترین اصول تخلقوا باخلاق اللہ، (اپنے آپ کو صفات الٰہی سے متصف کرو) پر عمل کر کے زیادہ سے زیادہ خدا سے قربت حاصل کرنا ہے۔ اسی بات کو حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے یوں فرمایا: ''صوفی کی پہچان یہ ہے کہ اس میں دریا کی طرح سخاوت سورج کی طرح شفقت اور محبت اور زمین کی طرح مہمان نوازی کی خصوصیات ہونی چاہیے''۔

شیخ شبلیؒ فرماتے ہیں کہ ''صوفی اس وقت صوفی ہوگا جب وہ سارے جہاں کو اپنے بال بچے سمجھے گا'' محبوب الٰہی حضرت شیخ نظام الدین اولیاء نے ایک جگہ ارشاد فرمایا:

''طاعت لازم اور متعدی ہے۔ لازم وہ ہے جس کا نفع کرنے والی کی ذات کو پہونچے، اور یہ نماز، روزہ، حج، ورد اور تسبیح ہے۔ متعدی وہ ہے جس سے اوروں کو فائدہ پہونچے، اتفاق، شفقت، غیر کے حق میں مہربانی کرنا وغیرہ، اسے متعدی طاعت کہتے ہیں، اس کا ثواب بے شمار ہے، لازم طاعت میں اخلاص کا ہونا ضروری ہے تاکہ بقول مشہور مؤرخ پروفیسر محمد مجیب، سابق شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ دہلی طاعت دونوں کے بغیر ممکن نہیں، مسلمانوں کی جماعت ایسے لوگوں کی جماعت ہونی چاہئے جو عبادتوں کے ذریعہ اپنے دل میں خلوص اور صفائی پیدا کریں اور متعدی عبادات کے ذریعہ دوسروں کو فیض پہونچائیں۔ ہمارے رسول نے دین کی تعریف سوال پوچھنے والے کی ذہنیت کو دیکھ کر کی اور صوفیوں نے جن کی تعلیم کا دارومدار نفسیات پر تھا ہمیشہ اس مصلحت کا خیال رکھا۔ ہمارے صوفی ایسے لوگ تھے جن کا جذبۂ دینی غیر معمولی قوت رکھتا تھا اور جماعت کے لئے حکومت کی سرپرستی سے کہیں زیادہ بڑا سہارا تھا۔ شیخ نظام الدین اولیاء کا ارشاد گرامی ہے کہ دنیا کے ترک سے یہ مراد نہیں ہے کہ انسان اپنے کو ننگا رکھے اور لنگوٹا باندھ بیٹھ جائے، بلکہ ترک دنیا اس بات کا نام ہے کہ لباس بھی پہنے اور کھائے بھی، لیکن جو کچھ سے ملے اس کی طرف راغب نہ ہو اور اس سے دل نہ لگائے۔

صوفیوں کا معیار وہ حسن خلق تھا جس کا کامل نمونہ ہمارے رسول کا عمل تھا، انہوں نے انفرادی طور پر اور آپس میں 'محبت فی اللہ' کا رشتہ قائم کر کے اجتماعی طور پر اسے برتا، اور نئے اور بدلتے ہوئے حالات میں عمل کے ذریعہ اس اصول کی تکمیل کی۔ پروفیسر مجیب نے تصوف کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مسلک تصوف ہماری تہذیبی تاریخ کی سب سے قیمتی یادگار ہے''۔

مقامات تصوف

سلوک یا تصوف کے اہم مقامات توبہ، ورع، زہد، فقر، صبر، توکل اور راضی برضائے الٰہی، سمجھے جاتے ہیں، اور یہ وہ مقامات ہیں جو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بہت عزیز تھے اور قرآن وحدیث میں ان تمام باتوں پر عمل کا حکم بڑی شدت سے آتا ہے۔ اور یہی تمام خوبیاں ایک صوفی خصوصیات سمجھی جاتی ہیں۔ تصوف کی ان خصوصیات پر عمل ہی کا نتیجہ تھا کہ عالم اسلام میں حضرت حسن بصریؒ، حضرت رابعہ عدویہ بصری، حضرت عبدالقادر جیلانی حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، حضرت شہاب الدین سہروردی حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی، حضرت فرید الدین شکر گنج، حضرت نظام الدین محبوب الٰہی، حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، اور حضرت مجدد الف ثانی جیسے جلیل القدر، فاضل واکابر صوفیہ پیدا ہوئے۔ ان جلیل القدر بزرگان دین، صوفیہ اور اہل اللہ کی خدمات کا ہی نتیجہ تھا کہ جب جب اسلام پر کوئی برا وقت پڑا چاہے وہ یورش تاتار ہو یا خلفت اسلامیہ کا زوال یا اسلامی حکومتوں کا سیاسی زوال تصوف یا صوفیہ کا انداز فکر فوراً اس کی مدد کو آیا اور اس کو اتنی قوت اور توانائی بخشی کہ کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہ کر سکی۔ اس حقیقت کا اظہار پروفیسر خلیق احمد نظامی نے تاریخ چشت میں ایک مشہور مؤرخ اور مستشرق (orientalist) ایچ۔آر۔گب (Gibb) کی آکسفورڈ یونیورسٹی میں ایک تقریر کے حوالے سے دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ گب نے کہا ''تاریخ اسلام میں بارہا ایسے مواقع آئے کہ اسلام کے کلچر کا شدت سے مقابلہ کیا گیا لیکن وہ مغلوب نہیں ہو سکا، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تصوف یا صوفیاء کا انداز فکر فوراً اس کی مدد کو آجاتا ہے اور اس کو اتنی قوت اور توانائی بخش دیتا ہے کہ کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔''

اس پس منظر میں جب ہم برصغیر ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ تہذیبی اور ادبی حیثیت سے ہمارے صوفیہ نے اہل ہند کو کس قدر متاثر کیا ہے۔

اردو، ہندی، پنجابی، بنگالی، مراٹھی، سندھی غرض ہندوستان کی تمام جدید زبانوں میں صوفیوں کا انسان دوستی کا پیام گھر کرنے لگا تھا، اور ہندو مسلم اتحاد اور یگانگت کے نتیجہ میں صوفی اور بھگتی تحریک اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور اسلام اور اس کے تصور وحدانیت سے متاثر ہو کر ہندوؤں میں سینکڑوں سنت اور بھگت پیدا ہو گئے، ان میں سکھ مت اور اس کے بانی بابا نانک، سنت کبیر، شمالی ہندوستان میں دیکھے اور محسوس کئے جا سکتے ہیں۔

صوفی اور بھگتی تحریک کے شعراء وارث شاہ، شاہ عبداللطیف بھٹائی نے پنجابی اور سندھی شاعری کو، شاہ منجھن شطاری اور ان کی تخلیق مدھومتی نے ہندی شاعری کو بھی متاثر کیا، گرو گرنتھ صاحب میں بابا فرید کے ۴ گیت اور ایک سو بارہ اشلوک ہیں، ان میں ملتانی و پنجابی الفاظ میں آپ نے انسان اور خالق کے رشتے، عشق خدا اور عام انسانوں سے محبت کو اپنے کلام کا بنیادی موضوع بنایا ہے۔

وارث شاہ کی ہیر و پنجابی زبان کی اہم ترین تخلیق ہے

اور دنیا کی ادبی تخلیقات میں اہم مقام رکھتی ہے، اس میں تصوف اور بھگتی کی آمیزش کا ایک خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے۔ ہیر کی ابتداء حمد، نعت، چار یار کی تعریف، پیران پیر اور بابا فرید کی مدح سے شروع ہوتی ہے۔

شاہ عبداللطیف سندھ کے صوفی شعراء میں ممتاز مقام رکھتے ہیں ان کی شاعری نے دنیا کے بہترین ادبیات میں اپنی جگہ بنائی ہے، انہوں نے قرآن، حدیث، مثنوی مولانا روم کا خصوصی مطالعہ کیا تھا، سندھی زبان کے تو عالم تھے ہی بلوچی، ہندی، پنجابی زبانیں بھی خوب جانتے تھے، اللہ اور مخلوق کے رشتے اور خالق کی عظمت اور جمال پر ان کے اشعار شدت سے متاثر کرتے ہیں۔

پروفیسر جیٹھ مل پرسرام نے اپنی کتاب (Life Ishah Bhatai) میں لکھا ہے کہ شاہ لطیف کی شاعری میں جہاں سندھی، پنجابی اور ہندی و بلوچی الفاظ ملتے ہیں وہاں عربی اور فارسی الفاظ بھی ملتے ہیں۔

جہاں تک اردو شعر و ادب کا تعلق ہے تو اس کی ابتداء اور ترقی تو صوفی، سنتوں کی ہی مرہون منت ہے۔ اردو کے دکنی ادب پر صوفیہ کی گہری چھاپ ہے، جس کی بنیاد دہلی میں امیر خسروؒ کے ذریعے سے بہت پہلے رکھ دی گئی تھی۔

موجودہ عہد میں بر صغیر ہندوستان میں (ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش) ہمارے قدیم سلاسل کی خانقاہیں اور اہل اللہ اب بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان میں دہلی میں درگاہ خواجہ نظام الدین الیاء میں خواجہ حسن نظامی مرحوم کے صاحب زادے خواجہ حسن ثانی نظامی، نقشبندیہ مجددیہ سلسلے کے بزرگوں میں اعظم گڑھ کے مجددیہ سلسلہ کے بزرگ، یوپی، میں خانقاہ تھانبھون سے جڑے علماء اور اہل اللہ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ، تبلیغی جماعت کے اکابر، ہمارے شہر بھوپال کی خانقاہ مجددیہ اور اس کے پیر طریقت، گلبرگہ شریف میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی خانقاہ کے بزرگ اور ان کے قائم کئے ہوئے جدید تعلیم کے ادارے، پاکستان میں دارالعلوم جھنگ کے نقشبندی مجددی سلسلہ کے پیر طریقت ذوالفقار احمد صاحب اور افغانستان کے سابق صدر اور موجودہ حکومت کے شریک کار صبغت اللہ مجددی آج بھی اپنے اپنے علاقوں میں تصوف اسلامیہ کے پیام کو عام کرنے میں اپنی سی کوششوں میں معروف ہیں۔

تصوف کے اس روحانی، تہذیبی اور تمدنی و ادبی ورثے پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ انسانیت کے بہت سے دکھ، درد اور تکالیف کا ایک ایسا حل پیش کرتا ہے جو موجودہ عہد کی سائنس اور ٹکنالوجی کے ہاتھ میں نہیں ہے اور جس کے لئے انسانیت مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک تلاش میں بھٹک رہی ہے، سماجی فلاح و بہبود کے میدان میں ہم اس کا علاج جمہوریت (Deureaey) اور حقوق انسانی کے چارٹر (eharter of rights) کی شکل میں اور تجارت و عالمی انسانی برادری کے میدان میں گلوبلائزیشن (Globalisation) اور تجارت کی پابندیوں سے آزادی کے اصولوں کی شکل میں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن یہ اصول صرف مادی آزادی کے اصول ہیں، ان سے انسان کی روح اور جسم مزید جکڑ بندیوں کا شکار ہو رہے ہیں اور اس کے نتیجہ میں تہذیبوں کے ٹکراؤ (Clash of civilization) جیسے خطرناک مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ جبکہ تصوف یا صوفی ازم وحدت خالق اور وحدت آدم اور مساوات انسانی نظریہ پیش کر رہا ہے جو انسان کو مادیت سے انسانیت اور محبت کے راستے پر ڈالنا چاہتا

ہے۔تعلیم کے میدان میں نام نہاد سیکولر تعلیم نے بے خدا، بے خالق نظام کو تشکیل دینے کی کوش کی لیکن جب وہ اس میں ناکام رہے تو آج وہ بھی اقدار یا (Values) کی بات کرنے لگے ہیں۔غرض روحانیت، انسانیت محبت اور اخلاق عالیہ سے حضرت انسان کو کہیں فراغت حاصل نہیں ہے۔

تعلیمی نقطۂ نظر سے موجودہ زمانہ ہم سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ہمیں نئی نسلوں کو تباہی کے گہرے غار میں گرنے سے بچانے کے لئے انسانیت کے پیام کو عام کرنے ہوگا، اور اس کو عام کرنے کا ایک سب سے اچھا طریقۂ کار جس کی اہمیت سے مشرق و مغرب کا کوئی سنجیدہ انسان منکر نہیں ہے۔ وہ انسان دوستی، تصوف اور بھگتی اور مشنری خدمات کا پیام ہے، جس میں مخلوق کی خدمت ہی خالق کی خدمت سمجھی جاتی ہے۔اس کا ایک عملی طریقہ یہ ہے کہ ہم ان نیک لوگوں، صوفیوں سنتوں کی سوانح اور کارنامے نوجوانوں کے سامنے پیش کریں اور ان پر عمل کر کے دکھائیں جس سے ان میں اپنے خالق سے محبت سخاوت، انسان سے اور اپنے آس پاس کے ماحول سے ہمدردی اور قلب و نظر میں روشنی اور نور پیدا ہو۔

مسلم نوجوانوں میں تصوف سے قربت ان کے اندر سے خوف کی کیفیت کو دور کرے گی، اللہ پر بھروسا پیدا ہوگا، ان کے اندر صبر و ضبط، سعی و کوشش اور خدمت کا جذبۂ ہمدردی پیدا ہوگا، جبکہ آج کی سخت مادی دوڑ اور جاہ و منصب کے حصول کے لئے دیوانگی نے انہیں ابلیسیت کی منزل پر پہنچا دیا ہے، میں اپنی بات کو اکبرالہ آبادی مرحوم کی صوفیانہ غزل کے مطلع پر ختم کرنا چاہوں گا، جس میں صوفی کے مقام سے بہت آسان لفظوں میں واقف کرایا گیا ہے۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

دنیا میں اس طرح رہو جیسے کہ کشتی میں بیٹھا ہوا ایک شخص جو پانی میں تو ہے، لیکن اس کا دامن اس کی کثافتوں سے پاک ہے۔

اس کے بعد ہی ہم اقبالؔ کی زبان میں کہہ سکیں گے:۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دئے ہیں اندازِ خسروانہ

□□□

کتابیات:۔

(۱) کشف المحجوب۔:۔از داتا گنج بخش علی ہجویری لاہوری، ترجمہ علامہ فضل الدین گوہر۔
(۲) صحبتے با اہل دل:۔از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔
(۳) ہندوستان اسلام کے سائے میں، از قاضی سید عابد علی وجدی الحسینی مرحوم۔
(۴) فتوح الغیب:۔حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، ترجمہ شمس صدیقی۔
(۵) غنیۃ الطالبین۔
(۶) اسلامی تصوف:۔از۔مولانا ڈاکٹر ابوسعید نورالدین۔
(۷) غوثِ اعظم:۔از۔مولانا احتشام الحسن کاندھلوی۔
(۸) ہمارا دین:۔(کتابچہ) از۔پروفیسر محمد مجیب۔
(۹) عشق الٰہی و عشق رسول:۔مؤلف۔پیر ذوالفقار احمد نقش بندی۔

رسائل:۔

(۱) ہندوستان کے علاقائی ادب میں تصوف کا جمال؟؟ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن۔سہ ماہی فکر و تحقیق (اپریل تا جون ۲۰۰۲ء)
(۲) تصوف احیائے دین کی روحانی تحریک۔از۔پروفیسر جعفر رضا۔سہ ماہی راہ اسلام (اپریل تا جون ۲۰۰۲ء)
(۳) تصوف: خدا پرستی اور انسان دوستی کا سنگم۔از۔نثار احمد فاروقی، ماہنامہ اردو دنیا (ستمبر ۲۰۰۲ء)

قرآن کریم کا اعجاز
اور اس کے فنی محاسن

رحمت اللہ نیپالی ندوی

قرآن کریم حضرت محمد ﷺ کا زندہ جاوید معجزہ ہے۔ قرآن نے امتوں کو زندہ کیا، مثالی اور اسلامی معاشرہ کو وجود بخشا اور باہم دست وگریباں نسلوں کو بے مثال مربوط وہم آہنگ کردیا۔ اسی کا فضل واعجاز ہے کہ اس نے عرب کے شتربانوں اور بکریاں چرانے والوں کو جہاں بانی اور حکمرانی تک پہونچادیا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

أخوك عيسى دعا ميتا فقام له
و أنت أحييت أجيالاً من العدم

(آپ کے بھائی حضرت عیسیٰ نے ایک مردہ کو پکارا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور آپ نے کئی نسلوں کو عدم سے وجود بخشا)

مشہور عالم دین وفقیہ مفتی محمد تقی عثمانی پاکستانی رقمطراز ہیں:

"قرآن کریم کی حقانیت کی ایک واضح دلیل اس کا اعجاز ہے، یعنی ایک ایسا کلام ہے جسکی نظیر پیش کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے، اسی وجہ سے اس کو سرورکونین ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ کہا جاتا ہے۔" (علوم القرآن، ص:۲۴۸)

اعجاز کیا ہے؟ شیخ محمد علی الصابونی اپنی مشہور کتاب "التبيان في علوم القرآن" میں لکھتے ہیں:

الإعجاز في اللغة العربية: هو نسبة العجز إلى الغير، قال تعالى (أأعجزت أن أكون مثل هذا الغراب فأواري سوأة أخي)

و تسمى المعجزة معجزة لأن البشر يعجزون عن الأتيان بمثلها، لأنها أمر خارق للعادة، خارج عن حدود الأسباب المعروفة، و إعجاز القرآن معناه: إثبات عجز البشر، متفرقين و مجتمعين، عن الإتيان بمثله۔" (ص: ۸۹)

(عربی زبان میں اعجاز کہتے ہیں عاجزی کی نسبت دوسرے کی طرف کرنا جیسے (أعجزت أن أكون، الخ)

کیا میں اس کوے سے گیا گزرا اور بے بس ہوگیا کہ اپنے بھائی کی لاش دفن کرتا معجزہ کو معجزہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کا مثل پیش کرنے سے انسان عاجز ہیں کیونکہ وہ معروف اسباب کے حدود سے خارج ہے۔ اعجاز القرآن کا مطلب ہے، اس کا مثل پیش کرنے سے انسان کی بے بسی ثابت کرنا خواہ وہ متفرق ہوں یا اکٹھا ہوں۔)

یادرہے کہ اعجاز کا تحقق تین امور کے پائے جانے سے ہوتا ہے:

(۱) تحدی (چیلنج)، (۲) تحدی کی تردید کے محرک کا قائم رہنا۔ (۳) مانع کا انتفاء۔ اعجاز کا کیا مقصد ہے؟ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے مؤلف "مناہل العرفان" تحریر کرتے ہیں:

"بل المقصود لازمه و هوا إظهار أن هذا الكتاب حق، وأن الرسول الذي جاء به الرسول حق، و كذلك الشأن في كل معجزات الأنبياء، ليس المقصود بها تعجيز الخلق لذات التعجيز" (مناهل العرفان، ج۲، ص: ۳۳۱، ايضا التبيان ،ص: ۸۹)

(اعجاز کا مقصد اس بات کا اظہار ہے کہ یہ کتاب برحق ہے اور اس کا لانے والا پیغمبر رسول برحق ہے، یہی بات انبیاء کرام کے تمام معجزات میں ہے، اس کا مقصود مخلوق کو محض عاجز وبے بس کرنا نہیں ہے۔)

قرآن پر انصاف کی نگاہ ڈالنے والے کو اس کے بہت سے مختلف وجوہ اعجاز نظر آئیں گے، ان میں چند وجوہ اعجاز حسب ذیل ہیں:

(۱) زبان واسلوب کا اعجاز۔ (۲) طرز تالیف۔ (۳) علوم ومعارف (۴) انسانی ضروریات کا بھرپور احاطہ (۵) کائناتی علوم کی

رعایت۔(٦) طریقۂ اصلاح اور طرز ہدایت۔(٧) غیبی خبروں کو سمولینا، خواہ اس کا تعلق ماضی سے ہو یا حال اور مستقبل سے، اس ضمن میں ہر غیبی خبر مستقل معجزہ ہے۔(٨) آیات عتاب، اس کی دو قسمیں ہیں: لطیف اور نرم عتاب۔ سخت اور کرخت عتاب۔ پہلے کی مثال سورۂ توبہ کی آیت ہے

"عفا الله عنك لم أذنت لهم حتى يتبين لك الذين صدقوا و تعلم الكاذبين." ہے جبکہ دوسرے نوع کی مثال "ما كان لنبي أن يكون له أسرىٰ حتى ......في الأرض إن الله غفور رحيم" ہے

(٩) وہ آیات جو طویل انتظار کے بعد نازل ہوئیں اس کی دلیل ہیں کہ قرآن کا کلام الٰہی ہے، کلام محمد نہیں، کیونکہ اگر کلام محمد ہوتا تو اتنے طویل انتظار کی مشقت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی مثال، تحویل قبلہ، واقعۂ افک، اصحاب کہف اور واقعہ ذوالقرنین اور روح کی متعلق استفسار، رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھا دینا اور اس کے لئے استغفار کرنا وغیرہ ہے۔

(١٠) نزول وحی کے وقت زبان کو حرکت دینا اور آیات کا نسیان کے اندیشہ سے حضرت جبریل امینؑ کے ساتھ دہراتے رہنا، جس کی ممانعت سورۂ قیامہ کی ان آیات "لاتحرك بي ب.....به إن علينا جمعه و قرآنه... ثم إن علينا بيانه" میں ہے۔

(١١) آیت مباہلہ۔ (فمن حاجك فيه من بعد ماجاءك من العلم، فقل تعالوا.... فنجعل لعنة الله على الكاذبين.

(١٢) خود حضور اقدس ﷺ کا قرآن کا بدل لانے سے عاجز رہنا۔

(١٣) وہ آیات جن میں نزول قرآن سے قبل آپ کے علم کی نفی کی گئی ہے۔ مثلاً: (و أنزل الله عليك الكتاب و الحكمة، و علمك مالم تكن تعلم، و كان فضل الله عليك عظيما۔" اور "و كذلك أوحينا إليك روحاً من أمرنا، ما كنت تدري ماالكتاب و لا الإيمان" اور "ماكنت ترجو أن يلقى إليك إلا رحمة من ربك" وغیرہ.

(١٤) قرآن کی تاثیر اور اس کی کامیابی۔ کہ اس کا اثر یکساں طور پر اعداء و اولیاء دونوں کے دلوں پر ہوا ہے۔(ملخص از مناہل العرفان، ج۲، ص:۳۳۲ تا ۳۱۲)

یہ قرآن کریم کے اعجاز کے واضح وجوہات اور گوشے تھے، ان کے علاوہ اعجاز کے کچھ مخفی اور دقیق گوشے بھی ہیں جنھیں قلم انداز کیا جاتا ہے۔

الغرض جن خصوصیات کی بنا پر قرآن کریم کلام معجز ہے ان کا احاطہ بشری طاقت سے باہر ہے، تاہم انسان کی محدود بصیرت کے مطابق انھیں چار عنوانات پر تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(١) الفاظ کا اعجاز۔ (٢) ترکیب کا اعجاز (٣) اسلوب کا اعجاز (٤) نظم کا اعجاز۔

١۔ الفاظ کا اعجاز:

کسی زبان کا کوئی شاعر یا ادیب، خواہ وہ اپنے فن میں کمال کے کتنے ہی بلند مرتبہ پر ہو، یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کے کلام میں کہیں بھی کوئی لفظ غیر فصیح استعمال نہیں ہوا ہے، کیونکہ بسا اوقات انسان اپنے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کسی نہ کسی غیر فصیح لفظ کے استعمال پر مجبور ہوجاتا ہے، لیکن پورے قرآن کریم میں الحمد سے لے کر الناس تک نہ صرف یہ کہ کہیں کوئی ایک لفظ بھی غیر فصیح نہیں ہے بلکہ ہر لفظ جس مقام پر آیا ہے وہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ایسا اٹل ہے کہ اسے بدل کر اسی فصاحت و بلاغت کے ساتھ دوسرا لفظ لانا ممکن ہی نہیں۔

٢۔ ترکیب کا اعجاز:

الفاظ کے بعد جملوں کی ترکیب، ساخت اور نشست کا نمبر آتا ہے۔ اس معاملہ میں قرآن کریم کا اعجاز اوج کمال پر ہے، قرآن کریم کے جملوں کے دروبست میں وہ شوکت، سلاست اور شیرینی ہے کہ اس کی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی، یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

قاتل سے قصاص لینا اہل عرب میں بڑی قابل تعریف بات تھی اور اس کے فوائد ظاہر کرنے کے لئے عربی میں کئی مقولے مشہور تھے۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

مفکر اسلام

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا اسلوب نگارش

ہندوستان کی خاک سے اٹھ کر جن لوگوں نے ہندوستان کا نام عالم اسلام میں روشن کیا ان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی جامع کمال شخصیت کا ذکر بطور خاص کیا جاتا ہے، وہ اپنے عہد کے یکتائے روزگار تھے، ان کے فضل وکمال کا شہرہ نہ صرف عالم اسلام بلکہ یورپ تک پہنچا، انہیں اردو عربی دونوں پر یکساں عبور دسترس حاصل تھی اور دونوں زبانوں میں ان کے قلم سے سو سے زیادہ کتب ورسائل نکلے اور علم ودانش، ادب وانشاء، تحقیق وتنقید، تاریخ وتذکرہ، سیرت وسوانح، تعلیم وتہذیب اور تمدن وثقافت کے میدان میں ان کی عظمت کے لازوال نقوش ثبت کئے جن سے بعد کا کوئی مؤرخ صرف نظر نہیں کرسکتا۔

مولانا علی میاں کی تصنیفات نے جس قدر شہرت ومقبولیت پائی برصغیر کے شاید ہی کسی اہل قلم کی تصنیفات کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی ہو، ان کی ایک ایک کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے، بعض کتابوں مثلاً ''دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' کئی لاکھ کی تعداد میں شائع ہوئی، دنیا کی کئی زبانوں مثلاً عربی، انگریزی، ہندی، ترکی، بنگلہ اور فرانسیسی میں ان کی کتابوں کے ترجمے ہوئے جو ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔

اس عظمت ومقبولیت کے اسباب کا اگر جائزہ لیا جائے تو جو اسباب وعلل سامنے آتے ہیں وہ مولانا مرحوم کے افکار وخیالات کی بلندی کے ساتھ ان کے بلند آہنگ اسلوب نگارش، شستہ وشگفتہ نثر، سادہ وپرکشش طرز بیان، استدلال کی قوت اور زبان وبیان پر حاکمانہ دسترس ہے اور اس بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ دراصل ان کی عظمت کا راز ان کے اسلوب میں مضمر ہے۔

ان کی پہلی تصنیف سید احمد شہید ۱۹۳۹ء میں جب شائع ہوئی اور مولانا علی میاں مصنف کی حیثیت سے پہلی بار سامنے آئے تو اس کتاب کی حیثیت محض ایک سوانح کی نہ تھی بلکہ اس میں جد وجہد اور آزادی وحریت کے جذبات جو وقت کی ضرورت تھے انتہائی خوبی کے ساتھ پیش کئے گئے تھے، اس کتاب کی نثر ایک پختہ مشق اہل قلم کا نمونہ معلوم ہوتی ہے تاہم اسے مولانا علی کے اسلوب کا نمونہ قرار نہیں دیا جاسکتا، اس لئے کہ یہ ان کی پہلی اور ابتدائی تصنیف ہے۔

سیرت سید احمد شہید سے لے کر ان کی آخری تصنیف کاروان زندگی کی جلد ہفتم تک انہوں نے مختلف موضوعات پر علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف کا ایک بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے جس کے ذکر کے لئے ایک دفتر درکار ہوگا تاہم اس کے مجموعی جائزے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا علی کا اپنا ایک خاص اسلوب نگارش تھا اور اسی اسلوب ہی نے ان کی تحریروں میں بلا کی جاذبیت پیدا کردی تھی، ان کی زندگی کے تمام نقوش بھی ان کے اسلوب میں دیکھے اور محسوس کئے جاسکتے ہیں، مثلاً سنجیدگی، متانت، وقار ان کی شخصیت کے ساتھ ان کے اسلوب نگارش کا بھی حصہ ہیں، انسانیت، رحم ومساوات ان کے پیام انسانیت کا اگر حصہ ہیں تو ان کی نثر میں بھی وسعت قلبی کے

یہ نمونے موجود ہیں، اسی طرح مولانا علی ایک بڑے خطیب اور داعی ومبلغ تھے چنانچہ ان کا اسلوب نگارش خطابت کے جوہر اور داعیانہ اوصاف سے بھی آراستہ ہے۔

مولانا کا مطالعہ بہت وسیع وعمیق تھا، مذہبی شعور کی پختگی کے ساتھ ان کا ادبی وتنقیدی شعور بھی بڑا پختہ تھا یہی وجہ ہے کہ وہ جن موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا نہ صرف حق ادا کردیتے ہیں بلکہ اپنے جذبات واحساسات بڑی بلند آہنگی سے پیش کرتے ہے جو ذوق ووجدان کو متاثر کردیتا ہے اور قاری ان کی تحریر کے طلسم میں اس طرح کھو جاتا ہے کہ گویا وہ اسی کے لئے قلم بند کی گئی تھیں۔

مولانا کے بیشتر علمی کارنامے تاریخ وتذکرہ اور سیرت وسوانح کے انداز میں شائع ہوئے اس وقت ان کے سامنے اردو کے عناصر خمسہ کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر صاحب اسلوب اہل قلم کی نثر نگاری کے نمونے موجود تھے ممکن ہے انہوں نے ان سے خوشہ چینی بھی کی ہو لیکن ان کی ابتدائی تحریروں پر مولانا حالی اور مولانا سید عبد الحی حسنی کے اثرات کے علاوہ کسی اور کا واضح [illegible] محسوس نہیں ہوتا، خاص طور سے گل رعنا جوان کے والد کی تصنیف ہے اس کے اثرات پورے طور محسوس ہوتے ہیں، یہ محسوسات دراصل ان کے اسلوب کی ارتقائی منزلوں کا پتہ دیتے ہیں، یہ ان کی نثر کا حصہ ضرور ہیں تاہم ان کے اپنے اسلوب پر اثر انداز نہیں ہوئے۔

مولانا علی میاں کے اسلوب نگارش میں کہیں ایجاز ہے تو کہیں اطناب، وہ کم لفظوں میں زیادہ بات کہنے اور فکر وخیال کو پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے اپنے موقف کو پھیلا کر بھی بیان کرتے ہیں یہ دراصل ان کی علمیت، تبحر اور زبان وبیان پر بے پناہ دسترس کا ثبوت ہے۔

ان کے اسلوب کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے اردو نثر کے مزاج ومذاق سے آشنا کر کے اردو کو ایک نیا طرز وآہنگ عطا کیا، ممکن ہے بعض نقادوں کو ان کے اس پہلو سے اختلاف ہو لیکن یہ بہر حال ان کے اسلوب کا ایک پہلو ہے البتہ اس میں کہیں کہیں عربی انداز نگارش وہ حسن نہیں پیدا کرتا جو اردو ادب وانشاء کے ذریعہ پیدا ہوسکتا تھا۔

ایجاز، اطناب، خطابت، جوش، سنجیدگی، وقار کسی تحریر کو جاذب قلب ونظر بنا دیتے ہیں ان سے جہاں نثر میں دل کشی پیدا ہوتی ہے وہیں کیف وسرور انبساط آگیں جذبات پروان چڑھتے ہیں اور شعور ودانش کے چشمے پھوٹتے ہیں، مولانا علی میاں نے اپنی تحریروں میں ان سے کام لے کر ادب وانشاء مین دلآویزی پیدا کی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسی اسلوب نے ان کے فکر وخیال اور تصنیفات وتالیفات کو قبول عام کا درجہ عطا کیا جو یقیناً ان کے علمی وادبی کارناموں کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

مختلف موضوعات پر انہوں نے داد تحقیق وتصنیف دی جس میں ماضی کی سبق آموز اور عبرت انگیز تاریخ بھی ہے اور حالات حاضرہ کے مسائل ومشکلات بھی، خشک فقہی مسائل بھی ہیں اور ادب وانشاء اور تحقیق وتنقید کے رموز ونکات بھی، تصوف وسلوک کے روح پرور واقعات بھی ہیں اور تعلیم وتعلم کے روشن امکانات بھی، کاروان زندگی کی تفصیل بھی ہے اور دعوت وعزیمت کے مثالی نمونوں کا بیان بھی، بزرگوں کے تذکرے بھی ہیں اور سیرت نبوی کا پاک اور مقدس ذکر بھی، غرض یہ کہ ان کی تحریروں کا دائرہ جس قدر وسیع ہے اسی قدر متضاد اور مختلف الجہات بھی ہے، ان تمام رنگوں کی آمیزش نے جو قالب اختیار کیا وہی دراصل مولانا کے اسلوب نگارش کا اصلی مرقع ہے، واقعہ یہ ہے کہ اسی جہات وتنوعات نے مولانا کے اسلوب نگارش کو آفاقیت اور ہمہ گیری عطا کی اور اسی نے انہیں نہ صرف امتیاز عطا کیا بلکہ بلند مقام تک پہنچایا جہاں ان کے معاصرین میں کوئی نہیں پہنچ سکا۔

ان کی تحریروں کے مطالعے وجائزے سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ انہوں نے قاری کی نفسیات پر پوری نظر رکھی، ان کے مزاج ومذاق کی رعایت کی مثلاً ان کی کتاب ''نئی دنیا امریکہ سے کچھ صاف صاف باتیں'' میں امریکی معاشرے اور امریکی قارئین کی نفسیات کا خیال رکھا گیا ہے، اسی طرح عربوں کے لئے جو طرز تخاطب استعمال کیا وہ بھی ان کے ذوق اور طرز زندگی کے لحاظ سے اختیار کیا گیا، اور اسی طرح نقوش اقبال میں فکر اقبال اور ممدوحین اقبال کے مرکزی نقطے پر نگاہ مرکوز رکھی گئی، ہندوستان اور خاص طور سے اردو قارئین کے لئے انہوں نے جو کچھ لکھا اس میں ہندوستانی مسلمانوں کی نفسیات اور معاشرے کے بنیادی مسائل پر نظر رکھی، قاری کی نفسیات کا خیال جس قدر مولانا علی میاں کی تحریروں میں نظر آتا ہے شاید ہی کوئی ان کا معاصران کی ہم سری کا دعویٰ کر سکے۔ غرض اسی نفسیاتی شعور نے ان کے اسلوب کی دلکشی ورعنائی میں اضافہ کیا، ان کے اس پہلو کا مبسوط مطالعہ ابھی تک نہیں کیا گیا ہے، ضرورت ہے کہ مولانا علی میاں کے علمی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے اس پہلو پر نظر رکھی جائے، یقیناً اس سے ان کی عظمت علمی کے نئے پہلو سامنے آئیں گے۔

مولانا کے ادبی محاسن اور اسلوب نگارش کا مشاہیر علم وادب نے اعتراف کیا ہے، اردو کے ادیبوں میں غلام رسول مہر، مولانا عبد الماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، ماہر القادری، قاضی عبد الستار اور شاہ معین الدین احمد ندوی نے ان کی ادبی عظمت کا اعتراف بڑے اچھے انداز میں کیا ہے، ان مشاہیر علم وادب کی تحریروں کی روشنی میں مولانا کے ادبی افکار کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ نہ صرف ادیب وانشا پرداز اور مبصر ونقاد تھے بلکہ ایک خاص نگارش کے واضع ونقاد بھی تھے۔

□□□

غزل

شہر، اجڑے ہوئے خوابوں کے بسائے کیا کیا
نیند میں ہم نے در وبام سجائے کیا کیا

ہم، کہ پھر تیری حقیقت پہ نظر کر نہ سکے
زندگی! تو نے ہمیں خواب دکھائے کیا کیا

موسمِ گل میں ترا ہم سے جدا ہو جانا
یاد آئے تو ہمیں خون رُلائے کیا کیا

کھو، سے جاتے ہیں کہیں، اس کا خیال آتے ہی
ہم اُسے بھول کے بھی بھول نہ پائے کیا کیا

مندمل ہو گئے سب زخم پرانے تو مگر
دل کی اک تازہ کسک ہم کو ستائے کیا کیا

لکھنے بیٹھیں جو کبھی عمرِ گزشتہ کا حساب
ایک اک لمحہ ہمیں یاد دلائے کیا کیا

کیا کہیں، وہ بھی ہمیں راس نہ آئی مخمور
اک خوشی جس کے لیے رنج اٹھائے کیا کیا

مخمور سعیدی
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، آر۔ کے پورم، نئی دہلی

□□□

الموعظة الحسنة

محمد شعیب کوٹی

جمعہ کے خطبے جو آج کتابی شکل میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، ان کی روایت بہت پرانی ہے، یہ خطبے عربی زبان میں بھی دستیاب ہیں اور اردو زبان میں بھی لیکن اردو زبان کے خطبے صرف کتابوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ان کو جمعہ کے خطبوں کے متبادل کے طور پر کبھی بھی قبول عام حاصل نہیں ہوسکا۔عربی زبان میں خطبات جمعہ کے جو مجموعے دستیاب ہیں ان میں سے زیادہ تر مجموعے مجہول المصنف ہیں، ایسے مجموعے اکثر مساجد میں زینتِ طاق بنے رہتے ہیں، ان خطبوں کے مندرجات پر اہل علم کے لئے تنقید کئے بغیر چارہ نہیں رہتا ہے۔ دور سلاطین قصۂ پارینہ بن چکا ہے، لیکن آج بھی ان کے لئے دوام وبقاء کی دعا کی جاتی ہے۔السلطان ظل الله في الأرض کا نظریہ شاہی استبداد کی کہانی سناتا ہے، اچھے اچھے ثقہ حضرات بھی اس پر نکیر کے بجائے خموشی کو ترجیح دیتے ہیں، ان خطبوں کے موضوعات بھی غیر متعلق سے ہوتے ہیں اور اگر یہ موضوعات برمحل بھی ہوں تو عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے ان سے استفادہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔

اس سلسلہ میں علماء کے اصلاحی اقدامات زیادہ تر مقامی زبانوں کے بجائے عربی زبان میں خطبوں کی نئی ترتیب تک محدود رہے۔لیکن اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ علماء مقلد نہیں تھے بلکہ صاحب استعداد تھے۔ حالات حاضرہ کے تقاضوں کو بخوبی سمجھتے تھے اس لئے اگرچہ انہوں نے زبان تو نہیں بدلی لیکن موضوعات میں حسن انتخاب کی نظیر ضرور قائم کر گئے۔ اسی طرح کے خطبوں کا ایک مجموعہ "الموعظة الحسنة" بھی ہے جو تیرہ سو ہجری (۱۳۰۰ھ) میں مصر کے شہر بولاق کے المطبعة الكبرى الميرية سے پہلی بار طبع ہوا۔۱۹۹ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ نواب صدیق حسن خاں صاحب قنوجی کے قلم سے ترتیب دیا ہوا ہے، اس پر نواب صاحب مرحوم کے بڑے صاحبزادے نواب سید علی خاں کے عربی میں مبسوط حواشی موجود ہیں۔

۱۲۹۵ھ میں یہ مجموعہ مرتب ہوا تھا، کسی وجہ سے اس کی طباعت پانچ سال بعد ممکن ہوسکی، اس وقت تک والیہ ریاست بھوپال شاہ جہاں بیگم نواب صاحب کے عقد نکاح میں آچکی تھیں۔اور والیہ ریاست بھوپال کے شوہر کی حیثیت سے نواب صاحب سرکاری طور پر ذمہ دارانہ اختیارات کے مالک شمار ہوتے تھے۔

نواب صاحب نجیب الطرفین سادات میں سے تھے، ان کے آباء واجداد میں علماء، فضلاء کی فہرست کافی طویل ہے، بہت کم عمر میں یتیمی سے دوچار ہو گئے اور پھر زمانے کی سرد وگرم ہواؤں کے تھپیڑوں سے الجھتے ہوئے انہوں نے اپنی زندگی گذاری، پروردگار عالم نے قدم قدم پر سہارا دیا، والد نے آبائی مسلک شیعیت کو پہلے ہی ترک کر دیا تھا، لیکن خاندان بدستور اپنے مسلک پر قائم رہا۔ایسے ماحول میں ایک یتیم نے زمانہ والل زمانہ کا کس طرح مقابلہ اور سامنا کیا ہوگا؟ اس کی تفصیل اپنی جگہ باعث عبرت وسبق آموز ہے، اتنا تو طے ہے کہ اس طرح کے ماحول میں پرورش پانے والے اگر یتیم ہوں، الله

نے ان کو صراط مستقیم پر ثابت قدم بھی رکھا ہو۔ تعلیم و تعلم کا سلسلہ صحیح سمت میں قائم و دائم بھی رہا ہو تو ایسے ہی افراد بلند درجات پر فائز ہوا کرتے ہیں اور خاص طور پر فکری و اعتقادی پہلوؤں سے وہ اپنی انفرادیت جریدۂ عالم پر ثبت بھی کر جاتے ہیں۔ نواب صاحب اس لئے بے نظیر عالم نہیں تھے کہ وہ ایک ملکہ کے شوہر تھے، بلکہ ملکہ نے خود ان کو اپنے شوہر کی حیثیت سے اس لئے منتخب کیا تھا کہ نواب صاحب اس وقت کی ریاست بھوپال کے جلیل القدر علماء میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔ اور عرب ممالک میں بھی ان کی شہرت پہونچ چکی تھی۔ ان کے تدین و تقوی کی مثال دی جاتی تھیں۔

وہ محض ایک عالم دین ہی نہیں تھے کہ دنیا سے الگ تھلگ ہو کر علمی و دینی نکتہ آفرینی میں مشغول رہتے تھے۔ بلکہ وہ زمانہ ساز بھی تھے۔ اپنے زمانہ کے حالات اور اس کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف تھے، جس طرح ان کے والد نے سچائی کو دریافت کر کے اپنے ماضی کے داغ دھبوں سے نجات حاصل کر لی تھی اس طرح نواب صاحب نے بھی علی وجہ البصیرت اپنی زندگی کو تعمیری مقاصد کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے ان کی تصانیف میں تنوع بہت ہے۔ تقریباً ہر اہم موضوع پر انہوں نے قابل قدر تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں۔

الموعظة الحسنة محض خطبات جمعہ کا کوئی روایتی مجموعہ نہیں ہے بلکہ عوام الناس اور خاص طور پر طبقہ علماء کے لئے مفید دینی و اصلاحی معلومات فراہم کرنے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ کسی مصنف اور اس کی تصانیف کو اس کے زمانہ کے تناظر میں جانچا اور پرکھا جائے تو تصنیف کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔

آج دیکھتے ہیں کہ جمعہ کے خطبات صرف ایک روایت بنے ہوئے ہیں حالانکہ پہلے کے مقابلہ میں آج ہر طرح کی سہولیات مہیا ہیں۔ آج سے سو سال پہلے کا تصور کریں۔ اس وقت نہ علماء کی اتنی بہتات تھی جتنی آج ہے اور نہ علماء میں اتنا توسع تھا کہ وہ جمعہ کے خطبات کو عوام کی دینی و اصلاحی تعلیم کا ذریعہ ٹھراتے۔

نواب صاحب نے خطبات جمعہ کی اہمیت کے پیش نظر یہ مجموعہ مرتب کیا، مجموعہ کی تمہید میں آپ نے اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

ثم إني رأيت خطباء بلدتنا هذه بهوپال وغيره من بلاد الهند أنهم كثيرا ما يأوون في الجمع والأعياد إلى خطبة واحدة لواحد من الناس فخطر ببالي أن استخلص لهم من خالص الدواوين المؤلفة في خطب العامة عدّه (لعله) تكون في بابها صفوة الصفوة و زبدة الزبدة فجمعت دواوين الخطب للحافظ ابن حجر العسقلاني وابن نباته المصري و جاد المولى و الشيخ الملواني وغير ذلك مما طبع بمدائن شتى وألف في القطر اليماني و نظرت فيها جميعا فاذا كل ديوان منها و إن كان قداتى بارعا في بابه و قام خطيبا في محرابه و جاء مغلقا في ايجازه و أطنابه و لكن حيث كان الأمر كما قيل،

وإنما يبلغ الإنسان طاقته
ما كل ماشية بالرجال شملال

لم ارتض من تلك المجاميع إلا ماجمعه الحافظ بن الجوزي رحمه الله وما انتخبه السيد العلامة الأكمل محمد بن احمد عبد الباري الأهدل من ديوانه وغيره من غيره لكونه آخذا بمجامع القلوب مفرغا في قالب البراعة البديعة الأسلوب فاثبتها في هذى الأوراق قدوة باهل الحديث وتيسيرا على خطباء الآفاق.

"بھوپال اور دیگر علاقوں کے خطیبوں کو ایک ہی خطبہ پر

ملتفی پاکر میں نے سوچا کہ کیوں نہ ایک ایسا مجموعہ مرتب کروں جس میں قدیم کے مستند خطبوں کا خلاصہ جمع ہو جائے، چنانچہ میں نے علامہ ابن الحجر عسقلانی، ابن نباتہ، جاد المولی، شیخ ملوانی اور یمن نیز دیگر جگہوں میں رائج بہت سے مجموعے دیکھ ڈالے، ان میں ادب و بلاغت، ایجاز واطناب کی چاشنی ضرور تھی لیکن وہ میرے معیار کے مطابق نہ تھے مجھے ابن الجوزی اور علامہ محمد عبد الباری الاحدل کے خطبے پسند آئے، ان خطبوں میں دلوں کو چھولینے والے عناصر موجود ہیں، ان کا اسلوب بھی پختہ ہے۔ میں ارباب حدیث کی پیروی میں ان کو اختیار کرلیا خطبہ دینے والوں کی سہولت بھی پیش نظر تھیں۔"

اس تمہید کے بعد لکھتے ہیں کہ! میں نے جمعہ وعیدین وغیرہ کے احکام بھی الگ سے تحریر کردیئے، یہ احکام کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں فرضی روایت سے اجتناب کیا ہے۔

ان مسائل کی تحقیق میں میں نے اپنے شیخ الامام شوکانی، علامہ محمد الامیر، حافظ المجد، حافظ ابن القیم کی تصنیفات سے استفادہ کیا ہے۔

یہاں نواب صاحب نے قاضی شوکانی کے لئے شیخنا و برکتنا الامام الشوکانی رحمہ اللہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس سے نواب صاحب کی نظر میں ان کے مقام کی اہمیت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ تمہیدی کلمات دو صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد صفحہ ۴ سے ۳۹ تک صلوۃ جمعہ، خطبۂ جمعہ، اور اسم علم "حمزہ" پر لام تعریف کے ادخال، جمعہ کی نماز کا وقت، عیدین کی نمازوں، خطبۂ عیدین، عیدین میں ماثور احکام، پھر عیدین پر خلاصۂ بحث، نیز قربانی، نماز استسقاء، مسائل نکاح، "بسملۃ"، "استعاذۃ" اور "تصلیۃ" یعنی درود وسلام کے عنوان سے ۳۵ صفحات میں محدثانہ وعالمانہ کلام بھی کیا ہے۔ یہ حصہ خاص طور پر مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔

اس حصہ میں نواب صاحب نے اپنی تحقیق کے جوہر دکھائے ہیں۔ حدیث میں ان کو خاص شغف تھا اسی وجہ سے وہ ہمیشہ احادیث کے حوالہ سے گفتگو کرتے ہیں۔ نقد وجرح بھی کرتے جاتے ہیں مثلاً جمعہ کی نماز کے وقت اور فضیلت پر گفتگو کے ضمن میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث:

فيه ساعة لايوافقها عبد مسلم و هو قائم يصلي فيسأل الله تعالى شيئا إلا أعطاه إياها. و أشار بيده يقالها متفق عليه کی تائید میں مسلم کا حوالہ دے کر ابوموسی اشعری کی روایت: سمعت رسول اللهصلى الله عليه وسلم يقول هي أي ساعة الجمعة مابين أن يجلس الإمام أي على المنبر إلى أن تقضى الصلوة،رواه مسلم. کے نقل کرنے کے بعد دوسرے ائمہ حدیث کی مختلف فیہ روایات بھی پیش کی ہیں۔ دارقطنی، ابن ماجه، ابوداؤد و نسائی، حافظ ابن حجر العسقلانی، قاضی شرف الدین المغربی اوران کی تصنیف "البدر التمام" کا بھی ذکر کیا ہے نیز "البدر التمام" کے بارے میں لکھا ہے کہ میں نے اپنی کتاب "مسك الختام"، اورابن القیم نے اپنی تصنیف "الهدى"، "البدر التمام" سے اس ضمن میں گیارہ اقوال جمع کیے ہیں۔ جو الفتح الباری میں مذکور ۴۳/ اقوال سے ماخوذ ہیں۔

یہاں نواب صاحب نے مختلف ائمہ حدیث، کتب احادیث اور ان میں مذکور مختلف الاعداد اقوال (صفحہ ۱۶) کے حوالہ سے گویا علم الحدیث کے بحر ذخار کی ایک ہلکی سی جھلک دکھادی ہے اس سے بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ نواب صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا یہ تمام کتابیں ان کی رسائی میں تھی اور وہ ان پر مکمل اور مجتہدانہ نظر رکھتے ہیں۔

جمعہ کی نماز کس پر واجب ہے اور اس کی ادائیگی کے

اوقات کون سے ہیں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے سارے اقوال کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے ایسے اقوال بھی درج کردیئے ہیں جو "اداء الصلاۃ عند الزوال و قبل الزوال" کی نشان دہی کرتے ہیں پھر ان سب اقوال پر جرح کرکے راجح قول پیش کیا ہے، چونکہ یہ سب مباحث عربی زبان میں ہیں اور ان کے مخاطب علماء ہیں۔اس لئے ایسے اقوال متنازعہ کا ذکر اور پھر جرح وتعدیل کے ذریعہ ان کی مرجوحیت کے اثبات سے علماء کے علم میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ان کے علم میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔نواب صاحب نے اپنے مقام ومرتبہ کے پیش نظر خطبات جمعہ کے اس مجموعہ کو ایک علمی وتحقیقی مجموعہ میں تبدیل کردیا ہے۔

ایک خاص بحث جس کا تعلق علم نحو سے وہ اس علم "حمزہ" پر لام تعریف (ال) کے ادخال کا ہے۔یہ ایسی بحث ہے جو اس طرح کے مجموعوں میں کہیں موضوع نہیں بنتی ہے۔

حضرت حمزہؓ کے نام کے ساتھ عموماً لام تعریف کا استعمال ہوتا ہے حالانکہ یہ نام اُعلام میں سے ہے، اس پر "ال" داخل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ نواب صاحب نے اس سوال کو ذہن میں رکھتے ہوئے صفحہ ۱۵ سے صفحہ ۱۶ تک ڈیڑھ صفحہ میں بہت جامع اور مبسوط کلام کیا ہے۔

شامی نے "رد المحتار" میں اپنے بعض شیوخ کا اشکال نقل کیا ہے کہ خطبہ میں "وارض اللھم عن عمي نبيك الحمزة و العباس" میں "حمزة" غیر منصرف ہے۔اس پر لام تعریف (ال) داخل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔اور جب لام کسی غیر منصرف کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو یہ لفظ منصرف ہوجاتا ہے؟ اس لئے یہ لحن میں شمار ہوگا۔

نواب صاحب نے اس پر علامہ حسین بن محسن السبعی کا قول نقل کیا ہے کہ: شامی کے اس قول کے دو پہلو ہیں۔

پہلا یہ کہ "حمزہ" پر لام تعریف کا دخول پہلے کبھی سماعت میں نہیں آیا۔یہ لحن شمار ہوتا ہے۔دوسرا یہ کہ جب اس نام پر لام تعریف ہوگا تو اس کو مکسور پڑھا جانا چاہئے، اس وقت یہ لفظ منصرف شمار ہوگا، اس صورت میں صرف ایک لحن باقی رہے گا، یہاں دو لحن جمع ہیں (یعنی غیر منصرف ہونے کے باوجود لام تعریف کا ادخال اور پھر لام تعریف کے ادخال کے باوجود اس کو غیر منصرف کی طرح مفتوح الآخر پڑھنا، م ش ک) جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اسماء منقولہ (یعنی مشتق اسماء۔م ش ک) میں عَلَمِیّت کے ساتھ لام تعریف کا دخول ایک عام سی بات ہے۔

اس جواب کے ذیل میں نواب صاحب معمر بن یحیٰ شارح قطر الندی، شرح الفاکہی، شارح الملحۃ علامہ دعسین، سلیمان بن محمد مفتی زبیر، شیخ الاسلام عماد الدین مفتی الحنفیۃ، علامہ المجد صاحب القاموس جیسے علماء اجل کی تحقیقات پیش کردی ہیں اور یہاں بھی ایک حدیث نقل کردی ہے کہ

إنه صلى الله عليه وسلم سمع رجلاً يلحن فقال ارشدوا أخاكم فقد ضل. کہ آپ ﷺ نے ایک شخص کو لحنِ کلام میں مبتلا پاکر فرمایا: اپنے بھائی کی رہنمائی کرو، وہ غلط راہ پر چل پڑا ہے۔

اس طرح کی ایک بحث "أمابعد" پر بھی ہے جو چھ (۶) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔اس بحث میں نواب صاحب نے نحو وبلاغت اور دیگر پہلوؤں سے جو داد تحقیق ہے اور احادیث وغیرہ کی روشنی میں جو نکتے سپرد قلم کئے ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔نواب صاحب نے اس مجموعہ کو علمی جواہر کا حامل بنادیا ہے۔

اس مجموعہ میں ہر ہجری ماہ کے عنوان سے پانچ پانچ خطبے درج ہیں۔اس کے بعد عیدین کے دو خطبے، اور سال کے آغاز و اختتام کی مناسبت سے مزید دو خطبے درج کئے ہیں یعنی نواب صاحب نے کل ۶۴ خطبے مرتب کئے ہیں، اس کے بعد ہجری مہینوں کے خصائص وفضائل پر احادیث کی روشنی میں بہت اچھا

مواد جمع کر دیا ہے یہ حصہ سات صفحات پر مشتمل ہے۔

اس مجموعہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، علامہ ابوالخیر نور الحسن الطیبؒ اور ابوالنصر علی حسن الطاہرؒ سے منسوب مزید چار خطبے بھی شامل ہیں آخر میں خطبۂ استسقاء، خطبہ کسوف وخسوف (دو خطبے) اور خطبۂ نکاح کے بعد شکر خداوندی کی ترغیب وتحریص پر مبنی ایک اور خطبہ بھی درج ہے۔ کتاب کے مشمولات میں فہرست شامل نہیں ہے۔

راقم الحروف نے اپنی سہولت کے لئے فہرست تیار کی ہے جو اس مقالہ کے ساتھ منسلک ہے، اس کی وجہ سے کتاب کے مشمولات ایک نظر میں معلوم کئے جاسکتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی وغیرہما کے خطبے اس مجموعہ کی قدر وقیمت میں اضافہ کا باعث ہیں۔

نواب صاحب نے اگرچہ ہجری مہینوں کی نسبت سے ۶۱ خطبے تحریر کئے ہیں لیکن بعض ہجری مہینوں سے متعلق جو موضوع روایات وواقعات عام طور پر متداول ہیں ان سے بالکل تعرض نہیں کیا ہے۔

البتہ بعض مواقع پر انہوں نے ایسی آیات واحادیث بھی ذکر کر دی ہیں جن کے موقع ومحل کے مطابق ہونے پر کلام کیا جاسکتا ہے، مثلاً ماہ شعبان کے دوسرے خطبہ کا اختتام سورۂ الدخان کی ابتدائی آیات:

"حم و الكتاب المبين إنا أنزلنا في ليلة مباركة۔ إنا كنا منذرين۔ فيها يفرق كل أمر حكيم۔ أمرا من عندنا إنا كنا مرسلين۔ رحمة من ربك إنه هو السميع العليم. (صفحہ ۱۰۱)

پر کیا ہے جیسا کہ اہل علم واقف ہیں ان آیات میں لیلۃ مبارکۃ اور فیہا یفرق میں جس رات کا ذکر ہے اس کو بعض حضرات شب برأت سے موسوم کرتے ہیں اور اس بنیاد پر شب برأت میں خصوصی دعاء وعبادت، نیز زیارتِ قبور کا بھی اہتمام کرتے ہیں شعبان کے خطبہ میں اس آیات کی شمولیت سے بجا طور پر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید نواب صاحب بھی شب برأت کی فضیلت اور شب برأت سے اس آیت کے متعلق ہونے کے قائل ہوں، یہ بحث چونکہ موضوع سے خارج ہے اس لئے یہاں ضرورت نہیں کہ نواب صاحب کی دوسری تحریروں کے حوالے سے اس کو طول دیا جائے، لیکن نواب نے اس خطبہ میں مذکورہ آیت پیش کر کے معترضین کے لئے بحث ومباحثہ کی گنجائش ضرور پیدا کر دی ہے۔

اگر صرف قرآن کی آیات کو پیش نظر رکھا جائے تو سورۂ الدخان کی آیت "إنا أنزلنا في ليلة القدر" کے الفاظ ہیں۔ "سورة الدخان" میں اس لیلۃ القدر کو "ليلة مباركة" سے تعبیر کیا گیا ہے اور سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۵" شهر رمضان الذى أنزلنا فيه القرآن" میں اس رات کو رمضان کی رات بتلایا گیا ہے۔ "القرآن يفسر بعضه بعضا" کے مطابق مہینہ اور رات کی یہی تعیین زیادہ قابل قبول ہوگی۔ یہاں پھر ایک ایسی بحث زیر بحث آگئی جو تفصیل طلب ہے اور تعارف کتاب کے موضوع سے خارج بھی۔

یہ "الموعظۃ الحسنہ" کا مختصر تعارف ہے۔ یہاں بعض خطبوں کے اقتباسات بھی دیے جاسکتے تھے، لیکن اس کی وجہ سے کہ مقالہ کے صفحات میں غیر معمولی اضافہ ناگزیر ہو جاتا۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

"الموعظۃ الحسنہ" کی افادیت آج بھی باقی ہے۔ لیکن افسوس کہ ایک سو انتیس (۱۲۹) سال پرانا یہ مطبوعہ مجموعہ دوسرے قیمتی مخطوطات کی طرح صرف لائبریریوں کی زینت بنا ہوا ہے حالانکہ یہ اس لائق ہے کہ اس کی بار بار اشاعت کی جاتی۔ کاش کہ کوئی فرد یا ادارہ اس خدمت کو انجام دینے کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر محمود شیخ اور ان کی کتاب ''علامیائی تفہیم''

ڈاکٹر محمد اشفاق عارف، ڈاکٹر صبا عظیم

سنگ مرمر کی حسین وادیوں اور ان کے بیچ لہراتی ندی کے سحر انگیز آواز کے ساتھ شہر جبل پور سے ابھرتا ہوا ایک نام ''ڈاکٹر محمود شیخ'' اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں اخلاقیات، رواداری، وسیع الخیالی سبھی کچھ موجود ہے۔ شیخ صاحب ایک دیندار اور مذہبی شخصیت کے مالک ہیں۔ لہذا ان کے مضامین میں ہمیں اسلامی ادب کے نمونے نظر آتے ہیں۔

ادب میں انہوں نے کئی حیثیتوں سے اپنی شخصیت وفن کا اظہار کیا ہے۔ وہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''بھری دوپہر میں آگ'' موضوعاتی ندرت اور اسلوب بیان کے اعتبار سے منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ خصوصاً ان کا افسانہ ''شعور بیچنے والا مداری'' اپنی منفرد پہچان رکھتا ہے۔ دیگر افسانہ بھی قابل تجزیہ ہیں اور انفرادیت رکھتے ہیں۔ چوں کہ رواداری اور وسیع المشربی ان کا شیوہ ہے لہذا ان کی تحریروں میں بھی ہمیں اسکے نقوش ملتے ہیں۔ جو ان کی شخصیت کو واضح کرتے ہیں۔ اور ان کے فن کی انفرادیت کو بھی۔

یہاں میں آپ کے مضامین کے مجموعہ ''علامیاتی تفہیم کا بیان'' کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ انکی شخصیت اور ان کے فن پر روشنی ڈالنا چاہوں گی۔

شیخ صاحب نے مغربی فن و فلسفہ پر تنقیدی نظریہ کے ساتھ اردو ادب میں نقد و نظر کا ایک نیا باب روشن کیا ہے۔ علامہ اقبال کی طرح وہ بھی اپنے نظریات کی وضاحت میں اسلامی اقدار حیات کا سہارا لیتے ہیں۔ اس ضمن میں شیخ صاحب کے مضمون ''جذبہ و تخلیق'' کا ایک طویل اقتباس پیش ہے جس میں انہوں نے ہندی فلسفہ اور یونانی حکمت کا موازنہ پیش کرتے ہوئے اسلامی طرز فکر کی بنیادی حقیقت کو واضح کیا ہے۔

''جب آرین تہذیب، دراوین پر قابض ہوئی تو اس نے جذباتی زندگی کے تصور کو منوسمرتی کی عقلی توجیہات کے ذریعہ ایک نئی پہچان عطا کی اور معاشرتی نظم حیات کو از سر نو قائم کیا۔ یہی تفریق یونانی فلسفہ کا طرۂ امتیاز بھی ہے۔ فیثا غورث وہ پہلا فلسفی ہے جس نے اکائی کی وحدت کو توڑنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اور یونانی معاشرہ کو سیاسی معاشرہ میں تبدیل کر دیا تھا بعد کو افلاطون نے دانشور کسان، دستکار اور سپاہی کے درجات اور حقوق متعین کئے تھے۔ مگر غلاموں کو معاشرتی حقوق حاصل نہ تھے اسلام نے غلامی کو عالم گیر انسانی فصل قرار دے کر ظلم و جبر اور استحصال کے اس راستے ہی کو بند کر دیا۔

تم انہیں غلام بناتے ہو جنہیں ان کی ماؤں نے آزاد جنا تھا۔

مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی اجرت ادا کر دی جائے۔

سود اور شراب کو اسلام نے حرام قرار دے دیا اور ان پر سخت سزائیں مقرر کیں۔ حسب نسب کو عام لوگوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔

''عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں، بجز تقویٰ اور پرہیز گاری کے۔

جس کو اس کے علم نے پیچھے چھوڑ دیا اس کا نسب آگے نہیں لا سکتا''۔

ڈاکٹر شیخ کا مطالعہ وسیع ہے۔ مذہب، سیاست، عمرانیات اور تاریخ کے علاوہ یونانی اور مغربی فلسفہ پر بھی انہیں دسترس حاصل ہے۔ ان کی نظر میں فلسفہ بذات خود نفسیاتی ذہن کی پیداوار ہے۔ اسی وجہ سے فلسفی اور فنکار کے افکار و نظریات نفس اور مادہ کی ترجمانی تک محدود ہیں۔ ادب اور فن کے جذباتی حقائق کو عام طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب جذبہ کی سچائی کے قائل ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ تہذیب و ثقافت کی تعمیر میں انسان کی جذباتی سوچ اور سمجھ نے نمایاں کردار انجام دیا ہے۔

آج کا دور جو سائنس اور تکنیک کا دور ہے اور اس دور جدید میں مذہب کو کافی حد تک ایک غیر ضروری دستور عمل قرار دیا جاتا ہے، کافی حد تک مگر شیخ صاحب کا نظریہ ہے کہ:

"مذہب نے اپنے ابتدائی ادوار میں زبردست کارنامے انجام دئے۔ اس نے انسان کو اخلاقی قدروں سے روشناس کیا اور سماجی ربط قائم کیا۔ رشتوں کو منظم کیا اور ان کی پاسداری کی تلقین کی۔ صالح روایات اور رسوم کی بنا مضبوط کی۔ نصاب عدل مقرر کیا اور بتایا کہ جمادات و نباتات و حیوانات سب کے سب مخلوق خدا ہیں۔ اور خدا وہ ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا۔ انسان کی تخلیق کی اور ہر شے کی ایک تقدیر مقرر کی۔ حقوق العباد مقرر کئے۔ خاصان خدا نے حقائق کو سمجھا اور خدمتِ خلق کو اپنا شعار بنایا۔ ان کا دل حرص و ہوس سے آلودہ نہ تھا۔ لہٰذا ان کے قول و فعل میں تضاد نہ تھا۔ ذرہ ذرہ میں خالق و مالک کا جلوہ دیکھ رہے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ایک ذاتِ واحد اس کائنات کی نگراں اور محافظ ہے۔ جس کے سامنے ایک دن سبھی کو حاضر ہونا ہے۔"

(علامیائی تفہیم کا بیان، ص:۹۵)

اس کتاب میں شامل مضامین جو ادب، فلسفہ، تکنیک، نفسیات، شعور، معیشت، اور جمال نفسی سبھی سے متعلق ہیں۔ قابل غور و فکر ہیں۔ جن پر ایک طویل اور مفصل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

(بقیہ صفحہ ۱۵ رکا).....دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کے زیر اہتمام ۴ ستمبر ۱۹۸۵ء منعقدہ "بزم سلیمان" پر ہوا جس کی صدارت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے فرمائی۔ اس بزم کے داعی مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری تھے۔ اس علمی و ادبی جشن میں سفیر جمہوریہ مصر جناب عمر موسیٰ، سید ہاشم علی وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ، پروفیسر خلیق احمد نظامی صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور متعدد علماء، ادباء و دانشور و شعراء نے شرکت کی، اس بزم میں سید صاحب سے متعلق ۵۰ مقالات پڑھے گئے اس موقعہ پر سید صاحب سے متعلق ایک نمائش کا بھی انتظام کیا گیا۔ اور سید صاحب کی مناسبت سے ایک شعری نشست بھی ترتیب دی گئی۔

بزم سلیمان کی پوری تفصیل اور مقالات پر مشتمل کتاب "مطالعۂ سلیمانی" دارالعلوم تاج المساجد کے اہتمام سے جون ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔ جس کو ڈاکٹر مسعود الرحمٰن ندوی اور ڈاکٹر حسان صاحب نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے مرتب کیا۔ اس میں سید صاحب اور بھوپال سے متعلق دو اہم مقالے "علامہ سید سلیمان ندوی اور ریاست بھوپال"، "پروفیسر عبد القوی دسنوی اور" آخری قاضی القضاۃ ریاست بھوپال" از قاضی سید عابد علی وجدی الحسینی شامل ہیں۔ مولانا علی میاں صاحب کے خطبۂ صدارت اور مولانا محمد عمران خاں ندوی کے خطبۂ استقبالیہ میں بھی سید صاحب اور بھوپال کا بار بار ذکر و بیان ہے۔ اس کتاب میں راقم الحروف کا مقالہ "علامہ سید سلیمان ندوی اور اقبال" بھی شامل ہے۔ یہ مقالہ مذکورہ "بزم سلیمان" میں پڑھا گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

دو بلّوں کا مکالمہ

○ مصطفیٰ صادق الرافعی (۱)　　○ ترجمہ: محمد وثیق ندوی

کمزور سا ایک بلا ایک گلی میں ایک چوہیا کا پیچھا کر رہا تھا، چوہیا نے کسی طرح بھاگ کر ایک بل میں چھپ کر اپنی جان بچائی، بلا بیچارہ وہیں کھڑا چوہیا کے نکلنے کا انتظار کرنے لگا اور اس کو پکڑنے اور شکار کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا، جانوروں کی عقل اپنے پیشے کے متعلق خوب کام کرتی ہے، دوسری طرف ایک ہٹا کٹا موٹا تگڑا بلا ٹہل رہا تھا، دور ہی سے اس نے اس مریل بلے کو دیکھا تو اس کی طرف چل پڑا، اتراتا ہوا، اکڑتا ہوا، شیر کی چال چلتا ہوا، جسم پر گوشت میں گوشت، چہرہ پر بے فکری ہی بے فکری، آنکھوں میں چمک ہی چمک، چال میں ایک تمکنت، قابل رشک صحت، طاقت سے بھرپور بدن، خوشحالی، فارغ البالی اور ناز و نعمت اس کی ایک ایک ادا سے عیاں تھی، اس صحت مند بلے کو دیکھ کر وہ دبلا بلا بڑا شکستہ خاطر ہوا اور حسرت و یاس سے اس بلے کو دیکھنے لگا، اتنے میں موٹا بلا اس کے بالکل قریب آ کر کھڑا ہوا، اسے اس کمزور بلے کے حال پر بڑا ترس آ رہا تھا، کہ بے چارہ کتنا کمزور، نحیف اور دبلا ہے، مارے بھوک کے پیٹ پیٹھ سے چپک گیا ہے، ہڈی ہڈی نظر آ رہی ہے، ایسا لگ رہا ہے کہ ہڈیاں اس کی کھال کو چھوڑ کر کسی دوسرے ٹھکانہ کی تلاش میں ہیں۔

موٹے بلے نے سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے کہا: ارے تم مُردوں کی طرح اس قدر سوکھ کیوں گئے ہو، کیا بات ہے تمہیں زندگی تو ملی ہے، تو پھر مردہ کیوں ہو؟ ہماری ہی جنس کی ایک بلی ہے جو شیر معلوم ہوتی ہے، اور ایک تم ہو کہ بلی سے بھی گئے گزرے ہو گئے ہو، کیا لوگ تمہیں دودھ نہیں دیتے، گوشت اور چربی نہیں کھلاتے، کھانے کو مچھلی نہیں ملتی، اور کیا تمہیں گھی اور ملائی میسر نہیں، کیا شوربے میں بھگوئی ہوئی روٹیاں نہیں ملتیں، بچے اپنے کھانے میں تم کو شریک نہیں کرتے، بچیاں اپنی گود میں تم کو نہیں کھلاتیں؟ کیا مالکن تم پر ہاتھ پھیر کر چمکارتی نہیں اور کیا تمہارا مالک تمہارے ساتھ اپنے لڑکے جیسا معاملہ نہیں کرتا ــــــ؟ تمہاری اس کھال کو کیا ہو گیا ہے، یہ اتنی میلی کیوں ہے؟ لگتا ہے تم نے ایک زمانہ سے اس کو چاٹا نہیں، اس کو صاف بھی نہیں کیا ہے، لگتا ہے کہ تم نے کبھی چمکتے بالوں والے بچوں اور بچیوں کو نہیں دیکھا، کم سے کم بال کو صاف ستھرا رکھنے میں ان ہی کی نقل کر لیتے، مجھے تو تم بڑے ڈھیلے ڈھالے، کمزور تھکے ہارے اور خستہ حال معلوم ہو رہے ہو، ایسا لگتا ہے تم کو نیند بھی نہیں آتی اور نہ ہی کبھی کوئی نعمت اور خوشحالی ملی، آرام کرنے کے لئے تمہیں نرم و گداز بستر کبھی نصیب ہی نہیں ہوا، تم تو اس شیر کے مشابہ لگ رہے ہو جو گھاس اور سوکھے ٹکڑے کھا کھا کر ادھ مرا ہو گیا ہو، کیونکہ گوشت گوشت سے اور خون خون سے بنتا ہے، جسم تو شیر کا ہے اور روح گدھے کی۔

لاغر بلے نے کہا: یقیناً آپ بڑے ہٹے کٹے، موٹے تگڑے، لحیم شحیم اور تنومند و طاقتور ہیں، کھانے کو دودھ، بلائی، مچھلی، انڈا اور مکھن بھی ملتا ہے، مانا کہ آپ اپنے جسم کی صفائی

ستھرائی کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں، سونے کے لئے آپ کے پاس آرام دہ گدا بھی ہے، جس پر پیر پسار کر آرام سے سوتے ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان نعمتوں اور راحتوں نے آپ کے ذہن کو کند کر دیا ہے، ظاہری زندگی تو آپ کی بڑی خوشحال نظر آتی ہے، لیکن آپ کی فطرت بگڑ گئی ہے، آپ نے ایک چیز پا کر دوسرے بہت سے اوصاف گنوا دئے ہیں، آپ نے آسودگی تو حاصل کر لی ہے، لیکن زندگی کی حقیقی لذت سے محروم ہو گئے، وہ لوگ آپ کے ساتھ نرمی، محبت اور پیار کا معاملہ تو کرتے ہیں، لیکن انہوں نے آپ سے آپ کی خودی، آزادی اور ذاتی صفات چھین لی ہیں، آپ خود اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتے، آپ غلامی پر مجبور ہیں، آپ کی حیثیت ان کے یہاں مرغی کی طرح ہے، جس کو ذبح کرنے کے لئے ہی موٹا کیا جاتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ لاڈ پیار اور ناز ونخرے سے ذبح کریں۔

یہ مانا کہ آپ اپنے مالک کے دسترخوان پر کھاتے ہیں، اور انہیں انواع واقسام کے کھانے کھاتے ہوئے للچائی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، لہٰذا آنکھ، پیٹ اور خواہش تینوں کی سیرابی کے آپ کو مواقع میسر ہیں، لیکن اس کے علاوہ آپ کو کچھ نہیں ملتا، گویا آپ ایک لقمہ روٹی اور بوٹی کے غلام ہیں اور آپ کی زندگی کا مقصد صرف کھانا ہی ہے، حالانکہ زندگی میں سب سے حقیر مقصد کھانا ہے، حالت کی یکسانیت صلاحیتوں کی سب سے بڑی قاتل ہے، انقلاب ہی سے زندگی میں ساری بہار ہے، رہا پیٹ تو پیٹ ہی رہے گا اور اس کی لذتیں بدلتی نہیں ہیں، لیکن ذرا سوچئے! آپ کے اسلاف کی میراث کیا ہے؟ اور وہ داخلی روح کہاں گئی جو ہمارے اعصاب میں حرکت ونشاط پیدا کر دیا کرتی تھی، جس سے ہم کو لذت حاصل ہوتی تھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کی وہ ہمیں ایسی زندگی عطا کرتی تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنے پورے جسم کے لئے جئیں نہ کہ صرف معدے اور پیٹ کے لئے؟۔

موٹے بلے نے جواب دیا، بخدا فقر وافلاس اور سخت کوشی نے تیرے اندر حکمت وزندگی پیدا کر دی ہے، میں تیرے مقابلہ میں اپنے کو اسلاف کی میراث سے محروم پاتا ہوں، اور مجھے اپنی بہ نسبت تیرے اندر ان کی صفات زیادہ نظر آتی ہیں، میں خدا کا واسطہ دیکر کہتا ہوں کہ مجھے وہ لذتیں اور نعمتیں بتلاؤ جو زندگی کے حقیر ترین مقصد (پیٹ کی آسودگی) سے بلند ترین مقصد (حقیقی اطمینان وسکون) کی طرف رہنمائی کریں، جو زندگی کی تنگیوں سے نکال کر وسعت آفاق تک لے جائیں؟۔

دبلے بلے نے کہا: آپ موٹے ضرور ہیں لیکن بدھو بھی ہیں، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ زندگی میں ابتلاء وآزمائش اور سخت کوشی ہی درحقیقت فکر وقوت کو مہمیز کرتی ہے، اور یہ فکر وقوت ہی تو ہیں جن سے زندگی میں لذت اور مزا حاصل ہوتا ہے، محرومی کا احساس ہی دراصل تجارت میں کمائی کی لذت بخشتا ہے، بھوک کی شدت ہی دراصل کھانے کی لذت کا راز ہے، دنیا کی جن لذتوں سے تم محروم ہو گئے ہو، آپ کا یہ ظاہری گوشت پوست ان کا بدل نہیں ہو سکتا ہے، ہماری خواہشات کے لئے ضروری ہے کہ ہم بھوکے بھی ہوں اور کھائیں بھی، تاکہ یہ بھوک اور یہ غذا ہمیں زندگی میں زندگی کا مزہ دیں، آپ کی طرح کی یہ پرسکون اور ناز ونعمت کی یہ زندگی حقیقت میں زندگی کا روگ ہے، اس لئے کہ جب لذت میں کمی کا احساس نہیں ہوگا تو لذت میں اضافہ بھی نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ زندگی کی یہ صعوبتیں اور مشقتیں زندگی کی لذت اور اس کے سرور میں اضافہ کا سبب بنتی ہیں۔

اصل خوشحالی تو یہ ہے کہ آپ کے اندر وہ باطنی قوتیں اور صلاحیتیں ہوں جو آپ کی زندگی کو عمدہ سے عمدہ تر بنا سکیں اور بری حالت کو مزید خراب ہونے روکیں، آپ کو یہ طاقتیں کیسے حاصل ہو سکتی ہیں جبکہ آپ مادہ اور معدے کی ایک چھوٹی سی دنیا

میں محصور ہیں، تنگ قید خانے میں مسرور و مطمئن ہیں، آپ تو پنجرے میں بند شیر کی طرح ہیں، جس کی جھاڑی چھوٹی ہوتے ہوتے پنجرا بن جاتی ہے، نتیجتاً وہ بھی چھوٹا ہوتے ہوتے کھال میں بند ایک متحرک تصویر بن کر رہ جاتا ہے، جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں آج بھی اپنے دانت اور پنجوں کے ساتھ شیر ہوں، میری کچھار پہلے بھی کشادہ تھی اور برابر کشادہ ہوتی جارہی ہے، مجھے کھلی فضاء میں وہی لذت محسوس ہوتی ہے، جو کھانے سے حاصل ہوتی ہے، اور مجھے مٹی میں بھی گوشت کا مزہ آتا ہے، بدبختی نام ہے نفس کی دو عادتوں کا: ایک حرص و ہوس کہ زیادہ بھی کم محسوس ہو، اور مجھ جیسا شخص جو قوت لایموت پر اکتفاء کرتا ہو اس کے اندر یہ عادت پیدا نہیں ہوسکتی، دوسری عادت یہ ہے کہ اتنے لالچی بن جاؤ کہ کمتر کو بھی کمتر نہ سمجھو، اور مجھ جیسے کفایت شعار میں یہ عادت بھی پیدا نہیں ہوسکتی، خوشحالی اور بدحالی میں وہی فرق ہے جو حق و باطل میں ہے، اس کا تعلق فطرت اور اندرونی صلاحیت سے ہے، اسباب و علل سے نہیں، جو شخص اپنی فطرت سے ہٹ کر کام کرتا ہے، وہ پریشانی اور بدبختی کا شکار ہوجاتا ہے اور جو اپنی فطرت کے مطابق کام کرتا ہے وہ مطمئن اور خوشحال رہتا ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ایک چوہیا کو دوڑایا تھا، وہ ایک بل میں گھس گئی ہے، اس میں مجھے بہت مزا آیا، اگرچہ مجھے اس کا گوشت نہیں مل سکا، کل ہی کی بات ہے کہ ایک شریر بچہ نے مجھے ایک پتھر کھینچ مارا، وہ مجھے مار ڈالنا چاہتا تھا، مجھے اس سے بڑی تکلیف ہوئی، لیکن مجھے اس تکلیف سے تحفظ اور احتیاط کا سبق ملا ہے، آج میں سامنے والے گھر میں گھسونگا، خدا کی قسم ٹوکری میں اچھل کود مچانے، لوٹنے کھسوٹنے اور اس کے بعد وہاں سے چھلانگ کر بھاگنے میں کتنا مزا آئے گا، کیا آپ کو بھی ایسا پر لطف موقع اور ایسی لذت کبھی حاصل ہوئی ہے، اور کیا چوہا یا چوہیا کی غفلت سے فائدہ اٹھانے، لوٹنے اور جھپٹا مارنے کا مزہ کبھی آپ کو ملا ہے؟ شریر بچوں یا ظالموں کو دھوکہ دیکر اور جان بچا کر بھاگنے کی خوشی کبھی آپ کو حاصل ہوئی ہے، اور اس لذت کو آپ کیا جانیں جب کسی بچہ نے آپ کو مارنے کی دھمکی دی ہو اور آپ نے بھی اسے نوچنے اور کاٹ کھانے کے لئے دانت نکالے ہوں اور وہ آپ سے ڈر کر بھاگ گیا ہو؟۔

موٹے بلے نے کہا کہ کیا دنیا میں ایسی بھی لذتیں ہیں، مجھے نہیں معلوم تھا، آو، مجھے وحشت ہورہی ہے، میں تمہارے ساتھ ساتھ رہوں گا، تاکہ مجھے تمہاری جیسی چالاکی، حیلہ اور تدبیر کی صلاحیت حاصل ہوجائے اور تمہاری جیسی راحت اور لذت مل جائے، میں بھی تمہارے ساتھ شکار کی گھات میں رہوں گا اور تمہاری طرح شکار کو دوڑا کر، کھلا کر اور تھکا کر شکار کروں گا، دبلے بلے نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا دوست تمہارا گوشت اور بھاری بھرکم جسم قیدی ہونے کی علامت ہے، میں اگر تمہارے ساتھ چلوں گا تو پہلا ہی پنجہ جو ملے گا تم کو پکڑ کر گرفتار کرلے گا، اور مجھے بھی مارے گا کہ میں آزاد گھوم رہا ہوں، آپ خود تو اپنے لئے مصیبت ہو ہی اور میرے لئے بھی مصیبت بن جائیں گے۔

بل میں چھپی ہوئی چوہیا دونوں کے درمیان باتیں سن رہی تھی، اور خوش ہورہی تھی، وہ دیر تک موقع کی تلاش میں رہی اور جیسے ہی موقع ملا جان بچا کے چھلانگ لگائی اور ایک کھلے ہوئے گیٹ میں گھس گئی، دبلا بلا اسے دیکھتا رہ گیا گویا آنکھ کے سامنے بجلی چمکی اور پھر غائب ہوگئی، اس نے موٹے بلے سے کہا: جاؤ یار، آپ کو اپنی حقیقت سمجھ لینے کے لئے یہی ایک موقع کافی ہے کہ آپ کے ساتھ تھوڑی دیر کھڑے ہونے سے ہاتھ سے شکار بھی نکل گیا، آپ جیسے دوسرے بھی ہیں جو ظاہری حلیہ بشرہ سے بڑے بہادر اور اعلیٰ ظرف معلوم ہوتے ہیں، لیکن

حقیقت میں وہ نہایت ہی بزدل اور کمتر ہوتے ہیں، وہ اپنے خوشنما انداز گفتگو سے بڑے ہی عقلمند نظر آتے ہیں لیکن معنی وحقیقت کے لحاظ سے بالکل بودے اور کم عقل ثابت ہوتے ہیں۔(وحی القلم)۔

□□□

---

(۱) مصطفیٰ صادق الرافعی عصر جدید کے مشہور ادبا میں ہیں، صاحب طرز، پختہ اور ٹکسالی ادیب ہیں، نثر کی طرح شاعری میں بھی بلند مقام رکھتے ہیں، محمود سامی بارودی اور شاعر نیل حافظ ابراہیم نے رافعی کے دیوان پر اپنے مقدمات میں ان کی شاعری کو خوب سراہا ہے، رافعی کا اسلوب نگارش بہت ہی دلکش اور خوبصورت ہے، الفاظ ڈھلے ہوئے موتی معلوم ہوتے ہیں، رافعی الفاظ کے انتخاب اور ان کی سج دھج اور معانی ومطالب کی گہرائی وگیرائی کی طرف بہت دھیان دیتے ہیں، اس لئے ان کا کلام بہت گٹھا ہوا چست اور بلند آہنگ ہے، تاریخی واقعات اور حوادث کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ گویا وہ نظروں کے سامنے ہوں، ان کے اسلوب بیان پر عبداللہ بن المقفع کا اثر کہیں کہیں صاف نظر آتا ہے، امیر شکیب ارسلان نے لکھا ہے کہ صدیوں سے رافعی جیسا ادیب پیدا نہیں ہوا، محب الدین خلیب لکھتے ہیں کہ پانچ سو سال سے عربی زبان وادب میں کوئی ایسا ادیب پیدا نہیں ہوا، جسے بلند معانی ومطالب کی مؤثر ادائیگی اور علوم ومعارف پر رافعی جیسا عبور حاصل ہو، لیکن بعض ناقدین نے رافعی کے اسلوب پر تنقید بھی کی ہے کہ اس میں تکلف اور تعقید ہے۔

مصطفیٰ صادق الرافعی مصر کے صوبہ قلیوبیہ کے ایک قریہ "بہتیم" میں جنوری ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں قرآن کریم حفظ کیا اور اپنے والد محترم عبدالرزاق (جو مفتی محمد عبدہ کے بعد دیار مصر کے مفتی عام مقرر ہوئے) کے پاس ہی بنیادی تعلیم اور علوم اسلامیہ سے واقفیت حاصل کی، اس کے بعد ابتدائی تعلیم "دمنہور" کے ابتدائی اسکول میں پھر منصورہ میں حاصل کی، بارہ سال کی عمر میں ابتدائی ڈگری حاصل کی اور طنطا کی مقامی عدالت میں کاتب (پیش کار) مقرر ہوئے، تیس سال کی عمر میں ایک سخت بیماری کا شکار ہوئے جس سے قوت سماعت متاثر ہوگئی اور علمی اداروں میں تعلیم جاری نہ رکھ سکے، لیکن شخصی مطالعہ میں منہمک ہوگئے، تاریخ، ادبیات اور اسلامیات کا گہرا مطالعہ کیا اور تمام علوم میں عبور حاصل کیا، جس کی شہادت رافعی کی تحریروں اور کتابوں سے ملتی ہے، رافعی نے اپنے شخصی مطالعہ سے علم میں جو مقام حاصل کیا وہ کسی سے مخفی نہیں ہے، محمود سامی بارودی، مفتی محمد عبدہ، لطفی منفلوطی، شیخ ابوالحسن علی حسنی ندوی اور انور جندی جیسے نامور فضلاء اور نابغۂ روزگار شخصیات نے رافعی کے ادبی مقام اور ان کے تخیل کی بلندی کو سراہا ہے۔

رافعی نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور بھرپور انداز میں عربی زبان وادب اور عربی شاعری کی خدمت انجام دی، ڈاکٹر طہٰ حسین نے شعر جاہلی کی تاریخی صحت اور حقیقت پر جو اعتراضات اٹھائے تھے ان کا تشفی بخش جواب دیا، اور طہٰ حسین کی کتاب "الشعر الجاهلي" کے جواب میں "تحت راية القرآن أو المعركة بين القديم والجديد" کے نام سے معرکہ آراء کتاب لکھی جو علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی، عربی ادب میں مغربی افکار ورجحانات پر سخت تنقید کی، مصر میں بعض متجددین نے عربی زبان کی تسہیل کے نام پر فصیح عربی زبان کے بجائے عامی زبان اختیار کرنے کی جو تحریک چلائی تھی اس کا جم کر مقابلہ کیا اور اس کے مضرات اور خطرناک نتائج سے قوم کو آگاہ کیا، رافعی کی مشہور کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:۔ تاریخ آداب العرب (تین اجزاء) تحت راية القرآن أو المعركة بين القديم والجديد، على السفود (تنقیدی مقالات کا مجموعہ) حديث القمر (تأملاتی ادب پر مقالات کا مجموعہ) رسائل الأحزان في فلسفة الجمال والحب، السراب الأحمر، أوراق الورد، كتاب المساكين، وحي القلم، كلمة وكليمة، ديوان مصطفیٰ صادق الرافعی۔

مصطفیٰ صادق الرافعی کی حیات وخدمات کی تفصیل کے لئے درج ذیل کتابوں کی طرف رجوع کریں: (۱) الفنون الأدبية وأعلامها في النهضة العربية الحديثة / انیس مقدسی (۲) الأدب العربي المعاصر في مصر / ڈاکٹر شوقی ضیف (۳) في الأدب الحديث / عمر دسوقی (۴) مصطفى صادق الرافعي / ابراہیم کوفی (۵) مصطفى صادق الرافعي والاتجاهات الإسلامية في أدبه / ڈاکٹر علی عبدالحلیم (۶) حياة الرافعي / محمد سعید عریان (۷) مصطفى صادق الرافعي فارس القلم تحت راية القرآن / محمد رجب بیومی (۸) مصطفى صادق الرافعي / کمال نشأت (۹) مصطفیٰ صادق الرافعي كاتباً عربياً ومفكراً إسلامياً / مصطفی شکعہ (۱۰) مجلة "الأدب الإسلامي" رابطة الأدب الإسلامي العالمية، شمارہ نمبر: ۴۳-۴۴ (۱۱) الرافعي الكاتب بين المحافظة والتجديد / نعمان البدری (۱۲) في موكب الخالدين / عبدالسمیع مصری (۱۳) الواقعية الإسلامية في الأدب والنقد / احمد بسام ساعی۔ (مترجم)

سراج میر خاں

اک شاعر درویش صفت

ڈاکٹر انیس سلطانہ

اسلاف کے کارناموں کو یاد رکھنا بھی خوش بختی ہے، تا آنکہ ان میں سے باقی رہ جانے والے عطیات ذہنی کو سنبھال کر رکھنا۔ سراج میر خاں سحر ایسی ہی دلاویز شخصیت کے مالک تھے۔ان کے حیات میں گو ان کی شاعری کی بڑی قدر ہوئی لیکن صوفیانہ بلکہ درویشانہ مزاج نے انھیں دنیوی داد و دہش کا اسیر نہیں کیا بہت..........کلام تلف ہو چکا۔اس میں ان کے مزاج کے ساتھ ساتھ کارخانہ قضا و قدر کا بھی دخل تھا۔ جتنی بار کلام یکجا کیا۔تلف ہوتا گیا۔ بالآخر اس درویش صفت شاعر نے اپنے کلام کی یکجائی سے ہاتھ اٹھا لیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مشاعرہ پر غزل پڑھتے اور کسی قدرداں کو تھما دیتے۔

حسن اتفاق سے بھوپال میں سر راس مسعود کی تشریف آوری اور ان کے ذوق جمال، مادری زبان سے محبت اور شعر فہمی نے از سر نو اس درویش صفت شاعر کی یادوں کو تازہ کرنے کا وسیلہ بنا دیا۔

والہانہ انداز کی یہ غزل جس کے مطلع نے ہی سر راس مسعود کو بہت متاثر کیا۔

سینہ میں دل ہے دل میں داغ، داغ میں سوز و ساز عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں پردہ نشیں کا راز عشق
فرش زمیں پہ مصطفٰے عرش بریں پہ کبریا
پہونچا کہاں سے کہاں سلسلۂ دراز عشق

گویّے کی زبان سے یہ اشعار سن کر آپ نے شاعر کے بارے میں جاننا چاہا، وہ جانتا ہی نہ تھا، کیا بتاتا، آخر کرنل انعام اللہ خاں صاحب نے سراج میر خاں سحر کے نام سے آگاہی دی۔اور یوں سر راس مسعود کے دل میں اس شاعر کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی آرزو جاگی۔سحر کے حالات اور ان کے کلام کو مرتب کرنے کے لئے مائل نقوی (عبد الجلیل مائل) کے ذوق کو نکھرا ہوا جان کر کام سپرد کیا گیا۔ جنھوں نے اسے ایک ''ادبی فرض'' جان کر انجام دیا۔

یوں تو شاعران گنت بھوپال میں اس وقت بھی تھے اور اس کے بعد بھی ہوئے، لیکن داغ دہلوی اور امیر مینائی کا جہاں طوطی بول رہا تھا، وہاں کسی دوسرے کے کلام کو وہ شہرت نہ مل سکی۔ سحر نے اپنے کلام سے خود ہی بے اعتنائی برتی وگرنہ زبان کی طاقت، بیان کی چاشنی، موضوعات کی برگزیدگی اور غزل کی رعنائی کے جوہر جیسے سراج میر خاں سحر کے یہاں نظر آتے ہیں۔ انھیں گمنام نہ رہنے دیتے۔ان کے مجموعۂ کلام ''بیاض سحر'' کے نام سے مائل نقوی صاحب نے ایک طویل دیباچے کے ساتھ شائع کیا۔

سراج میر خاں صاحب کا ایک اور نام افضل عبد خاں تھا، لیکن وہ سراج کے نام سے ہی مشہور ہوئے اور ابتدائی کلام میں سراج ہی تخلص کرتے رہے، یہ اور بات ہے کہ کلام لکھ کر اپنے پاس رکھ لیا کرتے۔ وہ بھی اس لئے کہ بھوپال میں فرمانروائے وقت ذوق شعری سے مالا مال تھے۔ نواب صدیق حسن بھی علم دوست تھے۔ان کے صاحبزادے علی حسن اور نور الحسن خود بھی شاعر تھے اور اکثر مشاعروں کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ امراء کے گھروں پر اکثر و بیشتر مشاعرے ہوا کرتے، اس ماحول میں سراج عبد خاں نے شعر گوئی کا آغاز ہی نہیں کیا بقول مائل نقوی

''جب عشقیں خوب چڑھ گئیں اور غزلوں کے انبار لگ گئے تو اس کی ضرورت ہوئی کہ کسی استاد سے مشورہ سخنی کیا جائے۔''

چنانچہ عنبر شکوہ آبادی کے شاگرد آغا مظہر، جو عنبر کے خلیفہ بھی سمجھے جاتے تھے، سراج میر خاں سحر نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ لیکن جلد ہی یہ سلسلہ ختم کر کے منشی نیاز احمد خاں نامی خیر آبادیؔ کی شاگردی اختیار کی اور فن شعر گوئی میں وقت کے بڑے بڑے اساتذہ کو پیچھے چھوڑ دیا۔

سحر کو نہ تو نام و نمود کی خواہش تھی اور نہ تعریف و توصیف کی۔ وجدان شعری انہیں بے قابو کر دیتا تھا اور بھوپال سے باہر بھی مشاعروں میں شریک بزم ہوئے مگر گوشہ گیری کے ساتھ اول اول ریاست سے توسل کے باعث جو شان و شوکت انھیں میسر تھی، اسے ترک کر کے تن تنہا نکل پڑے اور اپنے ذوق سیاحی کو انجام دیتے۔

مشاعروں میں غزل عالم وجدانی میں پڑھتے، نہ آواز بلند ہوتی نہ کسی شخص خاص کی طرف دیکھ کر پڑھتے۔ لیکن انداز غزل سرائی بڑا مسحور کن ہوتا۔ اور کیوں نہ ہوتا کہ یہ غزل دل سے نکلی ہوئی آواز تھی۔ بغیر انتخاب کے چند اشعار پیش کرنا چاہوں گی ۔

مرے آئینہ دل کو آکر دیکھ او خودبیں
چھپا رکھا ہے میں نے بھی حسین اک تیری صورت کا

تھم جاتے ہیں نالے تو ٹپک پڑتے ہیں آنسو
درد دل بے تاب بیاں ہو نہیں سکتا

طور پر حضرت موسیٰ نے تجلی ربانی دیکھے اور بے ہوش ہو گئے آکثر شعراء نے اس واقعہ کو اپنے اپنے طور پر غزل کا موضوع بنایا ہے۔ سحر غزل میں بھی یہ ایک پسندیدہ موضوع ہے ۔

میں وہ نہیں جو عشق کروں برق و شرار دیکھ کر
طور سے اٹھ کے جانے لگا جلوۂ یار دیکھ کر

گر پڑے کھا کے غش کلیم، خیر ہوئی کہ بچ گئے
طور غریب ہل گیا، جلوۂ یار دیکھ کر

رب أرني اور لن تراني کی اس تکرار کو اکثر شعراء نے استعمال کیا ہے۔ سحر نے بھی وجدانی کیفیت کے ساتھ حسن ازلی کو دیکھنے کی تمنا ظاہر کی ہے، نہ صرف تمنا بلکہ انسانی شرست کی ضد بھی کہ بندگان خاص کو یہ رتبہ بھی حاصل ہے مومن کا دل وحدت کے نشہ میں چور ہے۔ ارمغان شعری اس کیفیت کو بھی انوکھے آہنگ کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

پڑا جس بت کا عکس اس میں نظر آیا خدا ہو کر
رہا پہلو میں دل آئینہ وحدت نما ہو کر

یہی وہ مرتبہ ہے، جب عاشق جلوۂ خداوندی اس درجہ مغرور ہو جاتا ہے کہ ۔

مجھ خاک نشیں کا ہے دماغ آج فلک پر
کرسیٔ کا عمل پھوس کا چھپر ہے نظر میں

کون نہیں جانتا کہ دبستان لکھنؤ اور تصوف دو جداگانہ سمتیں ہیں لیکن سراج میر خاں سحر، جن کے دل میں عشق ازلی اپنی جگہ بنا چکا تھا، لکھنؤ کی ایک محفل مشاعرہ میں جہاں امیر مینائی بھی موجود تھے۔ اپنے رنگ خاص کو نہ صرف یہ کہ قائم رکھ سکے بلکہ مقامی اثرات کی بھی پاسداری کی۔ یہ قادر الکلامی ہے جس نے سحر کو شعرائے بھوپال میں ایک نمایاں مقام پر لا کھڑا کیا ہے ۔

اے شیخ یہ کچھ رحمت خالق سے نہیں دور
میدان قیامت بھی جو رندوں کے رہے ہاتھ

اہل دل جانتے ہیں کہ یہ رندان بلانوش نہیں رندان باضط ہیں۔ اس غزل کا ایک شعر اور حاضر ہے ۔

دریائے کرم جوش پہ ہے موسم گل کا
ہر شاخ ہے گلزار میں پھیلائے ہوئے ہاتھ

الغرض صفائے باطن کہ تصوف کی اصل ہے، سحر کے کلام کو ایک خاص مقام عطا کر رہی ہے اس پر مستزاد شاعرانہ پیش کش، الفاظ کی دلکش، بیان کی رعنائی اور از دل خیزد و بر دل ریزد والا معاملہ۔ اس مختصر سے مجموعہ کی ہر غزل پیکر حسن ہے اور دل والوں کے لئے نشتر بھی۔

☆☆☆☆☆

کہانی

ماں صاحب

.....ترنم ریاض

جانماز پر بیٹھی ماں صاحب نے سر اوپر اٹھا کر خرم کی جانب دیکھا تو روشنی سے ماں صاحب کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔

''خدا اس کی عمر دراز کرے بیٹا...ابھی معصوم بچہ ہے...اگلے برس چلا جائے گا.... عمر پڑی ہے اس کی.....میں.....میں کتنے دن اور زندہ رہ لوں گی...''

انھوں نے ادھ مندی آنکھیں میچ کر سر جھکا لیا۔ مگر ان کے کان خرم کی آواز کے منتظر رہے۔

ان کے ماتھے کے قریب نظر آنے والے بال، سر پر اوڑھی چادر سے زیادہ سپید نظر آ رہے تھے۔ تسبیح پھیرنے کی رفتار کے ساتھ آڑی ترچھی لکیروں والی ٹھوڑی اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ چھوٹی سی جانماز پر بیٹھی ماں صاحب سکڑتے سکڑتے اتنی ہو گئیں تھیں کہ اگر جانماز موجودہ سائز سے نصف کر دی جائے، جب بھی وہ اس پر بہ آسانی نماز ادا کر سکیں۔

ماں صاحب کب اتنی نحیف ہوئیں، پتہ ہی نہ چلا۔ خرم کے دل میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ پاس سے تیز چل کر اندر جانے کی کوشش میں ہانپتی شگوفہ پر نظر پڑی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی بھری بھری انگلیوں سے کنپٹیاں ایسے تھام رکھی تھیں جیسے ہاتھ ہٹانے سے سر کے زمین پر گر جانے کا اندیشہ ہو۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا شگوفہ کا بھاری بدن رفتار کے ساتھ داہنے بائیں جھکتا تھا۔ کمر کے معمولی طور پر سے نمایاں خم کو چھوڑ کر سارے جسم پر چربی نے قبضہ جما رکھا تھا۔

''ہے نا بیٹا...میں کتنے دن تک رہوں گی اب.....ٹھیک ہے نا...؟''

خرم نے نظریں اندر جاتی ہوئی شگفتہ سے واپس لا کر ماں صاحب کی طرف موڑیں۔ ماں صاحب دوبارہ گردن اوپر کیے آنکھیں جھپک جھپک کر بیٹے پر پتلیاں مرکوز کرنے کی کوشش کر رہیں تھیں۔ آنکھ کے آپریشن کے بعد ایک آنکھ کی پتلی کسی شے پر زیادہ دیر مرکوز کرتے وقت اس آنکھ میں بھینگا پن آ جاتا تھا۔ تسبیح فاطمہ کا ورد کر رہی ماں صاحب کی زبان ایک ردھم سے تالو سے لگتی تھی اور انگلیاں تسبیح کے دانوں پر تیزی سے چل رہی تھیں۔

بسملہ۔ خرم نے زیر لب کہا تو عجب حسرت بھری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر چھا گئی۔

''بسملہ...'' زاہدہ نے بڑی بڑی سیاہ پتلیوں والی آنکھوں کو مزید پھیلا کر کہا اور لام کی آواز نکالتے وقت لاجوردی سے ہونٹوں والا دہانہ وا کر کے تالو سے جا ملتی زبان کا لام کہنے والا عمل سمجھانے کے لئے چار سالہ خیرو کے گول گول چہرے کے عین سامنے اپنا چہرہ لے جانے کے لئے فرش پر بیٹھ گئی۔

''ایسے ہی کہا تھا.....ہم نے بھی.....''

خیرو نے روٹھی روٹھی آواز میں کہا اور ہاتھ میں تھاما چیچ ہفت رنگ پھولوں والی تام چینی کی پلیٹ میں رکھ دیا۔

''نہیں کھائیں گے...ہم...'' اس نے زاہدہ کی زبان کی طرف دیکھا جو لام کہہ کر ابھی ابھی تالو سے الگ ہوئی تھی۔

''کیوں نہیں کھائیں گے.....'' زاہدہ نے کچھ اونچی آواز میں کہا اور ہاتھوں میں تھامی خیرو کی دونوں کلائیاں جلدی سے چھوڑ دیں۔ایسے میں اس کی چوڑیاں چھن سے بجیں تو خیرو اس کے ہاتھوں کی جانب دیکھنے لگا۔

''اس لئے کہ آپ نے زور سے پکڑے تھے... ہاتھ ہمارے....''

اس نے دھیرے سے کہا پھر زاہدہ کے چہرے کی طرف دیکھا اور منہ دوسری طرف موڑا جہاں سے دسترخوان پر چنی نعمتیں نظر آنے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔اور خاص کر باریک سفید چینی کی قاب جس کے پار سے دسترخوان کے سرخ پھول تک نظر آتے تھے اور جس میں زاہدہ نے اس کی پسند کی ضیافت یعنی نرم نرم آلو کے بھورے بھورے قتلے پروس رکھے تھے۔

تام چینی کی رکابی اپنی طرف سرکاتے ہوئے زاہدہ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہم کھلائیں گے اپنے بچے کو...مگر پھر بچے کیسے سیکھیں گے اگر سمجھایا نہ جائے....آپ لام پر تشدید بھول جاتے ہیں نا.....''

زاہدہ نے اسے اپنے زانو پر بٹھایا۔

''دھیرے سے ہاتھ پکڑ کر بھی تو سمجھایا جاسکتا تھا نا.....''

خیرو زاہدہ کے چہرے کی طرف دیکھ کر سمجھانے کے انداز میں زاہدہ ہی کی طرح بار بار پلکیں جھپک کر بولا کہ اب اور روٹھے رہنا قتلوں کے ذائقے کو ترستی زبان کے لئے ممکن نہ تھا اور اس کی زبان بھی صاف تھی۔زاہدہ کو ہنسی آئی تھی مگر وہ مزید ذرا گہرا سا مسکرا کر رہ گئی۔

''اوہ...اس کے لئے ہم معافی مانگتے ہیں.....''

زاہدہ نے کانوں کو ہاتھ لگایا تو خیرو نے دیکھا کہ سیلنگ کے درمیان لٹک رہے فانوس سے ملتے جلتے جھمکوں کے ساتھ بندھے بہت سے چھوٹے چھوٹے سرخ موتی (جو ہلکے ہلکے جھولا سا جھولا کرتے تھے) زور زور سے ہلنے لگے تھے۔زاہدہ نے کانوں سے ہاتھ ہٹائے تو ننھے ننھے سرخ موتیوں سے نظریں ہٹا کر خیرو نے رکابی کی طرف دیکھتے ہوئے منہ بڑا سا کھول دیا۔موتی خرگوش کی آنکھ کی طرح چمک رہے تھے مگر خرگوش کی آنکھ سے بہت چھوٹے تھے۔اس نے ایک سیکنڈ کے لئے زاہدہ کے کانوں کی طرف نظر ڈالی اور پھر رکابی کی جانب دیکھنے لگا۔زاہدہ آلو کو کانٹے میں پروئے پھونک مار کر ٹھنڈا کر رہی تھی اور کچھ ہی دیر میں قتلہ خیرو کے منہ میں آنے والا تھا۔

''اب ہمارا بچہ جلدی جلدی کھائے گا.....پھر ابو کے ساتھ تھوڑا سا کھانا بھی کھاتے ہیں نا اچھے بچے.....''

زاہدہ نے اس کے گال پر ایک بوسہ ثبت کیا۔

''جی.....''

آلو چباتے ہوئے وہ سر ہلا ہلا کر جھومتے ہوئے بولا تھا۔

جب تک خیرو کے ہاتھ پاؤں تھوڑے لمبے ہوئے تھے، وہ زاہدہ کے ہی ہاتھ سے آلو کے قتلے کھاتا تھا کہ اوپر سے ٹھنڈا نظر آنے والا گستاخ قتلہ منہ کے اندر جاتے ہی اس کی زبان جلا دیتا۔مگر پھر اپنے ہی ہاتھ سے کھانے سے بھی ایسا اکثر ہی ہونے لگا تھا اور وہ دہانہ وا کر کے زور زور سے سانس اندر باہر کر کر کے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا تو زاہدہ جانے کہاں سے پانی لیے آ پہنچتی۔

انہوں نے کیسے سانس کی آواز سن لی تھی اتنی دور سے۔ خیرو سوچ کے رہ جاتا۔

''اگر ہم گھوم گھوم کر کھائیں گے تو پانی ساتھ کیسے دے.....''

وہ جب بھی سمجھانے کے ہی انداز میں کہا کرتی۔

خیرو نے اپنے ساتھ زاہدہ کو بھی بڑا ہوتے دیکھا تھا۔مگر جب اس کا قد اور لمبا ہوا تو اس کی دونوں چچیاں موٹی ہو گئی تھیں اور ان کے اچھے اچھے کپڑے ان کی کمر میں پھنس جاتے تھے اور

کبھی کبھی وہ گاؤ تکیے سی لگتیں تھیں۔ مگر زاہدہ پہلے کی ہی طرح تھی۔ مشن سکول کی پیرینٹ ٹیچر میٹنگ میں جب بچے کہتے کہ خیرو کی مدر بہت کیوٹ ہیں تو اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ خیرو نے زاہدہ کو ہمیشہ بچوں کی ہی طرح پلیٹ میں تھوڑا سا کھانا لیتے دیکھا تھا۔ گھر کے لوگ کھانے پینے کے خاصے شوقین تھے۔ خیرو کے ابو بھی دیر تک کھانے کی میز پر نظر آیا کرتے۔

زاہدہ پانچ نمازوں کے علاوہ بھی کچھ اور نمازیں پڑھا کرتی اور رمضان کے علاوہ بھی کئی روزے رکھا کرتی۔ گھر میں ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آتی۔ چادریں کاڑھنے سے لے کر ملازمین کے ساتھ مل کر باغیچے کے حوض صاف کرنے تک۔ کچن گارڈن میں پھول سبزیاں اُگانے تک۔ اور زاہدہ کو پودوں میں پانی کھاد ڈالنے اور کھانا بنانے جیسے کام کرتے دیکھ کر خیرو خیر سے بڑا ہو گیا تھا۔

یہ بیسویں صدی کے وسط کے آس پاس کے دن تھے۔ لوگ کچھ سرحد پار ہجرت کر گئے تھے۔ بعض اپنی زمینوں سے لگے رہے۔ جاگیریں ضبط ہونے لگیں تو محنت کش لوگ سر اٹھا کر جینا سیکھنے لگے۔ بدلتی اقدار سے جب استحصال شدہ لوگوں نے آرام طلبوں کو جی کھول کر مذاق کا نشانہ بنایا تو زاہدہ اس کی شکار نہ ہوئی کہ اس کی ملنسار طبیعت ہر دل عزیز تھی۔ زمینوں کو مستقل قسم کا سرمایہ سمجھنے والے گھر کے حاکموں نے صرف پیسہ جمع کیا تھا۔ مستقبل کے لئے کسی قسم کی سرمایہ کاری کر کے مالی حالات کو مضبوط نہیں کیا تھا۔ زمینوں کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ جمع شدہ پیسہ بھی ختم ہوتا گیا۔

دونوں دیور منقولہ جائداد کا بڑا حصہ لے کر ہجرت کر گئے۔ ان کی والدہ ان کے ساتھ نہیں گئی تھیں۔ وہ اپنے بڑے بیٹے اور بہو کے پاس رہیں۔ اور ان کا خیرو سے بھی دوستانہ رشتہ تھا۔ زاہدہ کے شوہر کا انہی دنوں انتقال ہو گیا۔ پھر والدہ بھی زیادہ دن تک زندہ نہیں رہیں۔ مگر گھر کا ظاہری رکھ رکھاؤ ویسے ہی قائم رہا۔ خیرو کی تعلیم بلکہ کچھ اور اہتمام سے جاری رہی۔ دبلی پتلی ناخواندہ ماں کے کام کی صلاحیت اور مستقبل کے مشوروں پر خیرو کی عقل حیران رہ جایا کرتی۔

اپنے ساتھ اس نے ماں کو بھی بدلتے دیکھا تھا۔ جب چھوٹا تھا تو ماں کے ہاتھوں میں بہت سی چوڑیاں ہوا کرتیں۔ لباس کے رنگوں جیسے آویزے اور کنگن۔ ماتھے کے اطراف اس کے بال لہراتے بہت اچھے لگتے۔ جب ماں اسے گود میں لیا کرتی تھی تو اس کے کندھے کے پاس سے چنبیلی کے پھولوں کی سی خوشبو آتی جس کی بیل باغیچے کے پیچھے والے کونے میں جھولے کے قریب کی دیوار پر چڑھی رہتی۔ خیرو جب دسویں درجے میں تھا تو ماں نے چوڑیاں بندے پہننا چھوڑ دیئے تھے۔ صرف کلائی میں گھڑی تھی اور گلے میں چھوٹے موتیوں کی بڑی سی مالا۔ وقت سے پہلے ہی ماتھے کے اطراف بال خاصے سفید ہو چلے تھے اور سفید موتیوں کی مالا کے ساتھ خوب جچتے تھے۔ خدا حافظ کہتے وقت ماں اس کے ماتھے کا بوسہ لیتیں تو ان کے پاس سے وہی گل یاسمین کی مہک آیا کرتی۔

ماں صاحب جب اور بڑی ہو گئیں اور خرم بھی بڑا ہو کر اور بڑا افسر بن گیا تو ماں نے اس کے لئے اسی کی طرح پڑھی لکھی اور ہری ہری آنکھوں والی دلہن ڈھونڈ لی جو خود بھی بڑی افسر تھی۔

ماں صاحب نے گھر سنبھالے رکھا اور دلہن کی زچگی بھی ماں کی ہی طرح کر کے اسے دفتر کے لئے چاق و چوبند کر دیا۔ ماہم کی دیکھ بھال خود کرتی رہیں اور پھر کوئی تین برس بعد قیصر کی بھی۔ ماں صاحب نے بیٹے کے بچوں کی بھی اسی انداز سے عمدہ پرورش کی گو کہ وہ اب پہلے کی نسبت کمزور ہو گئی تھیں۔ خاندان میں بھی اور خاندان سے باہر بھی ماں صاحب کے ایسا احترام اور کسی کو نصیب نہ تھا۔

ماہم پڑھ لکھ کر برسرِ روزگار ہوئی تو اسے وداع کر دیا گیا۔ جب ہی پھر ماں صاحب کو ذرا دم لینے کی فرصت ملتی محسوس

ہوئی۔اور پھر انھوں نے حج کو جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔خرم بخوشی تیار ہوگیا۔

''تمہیں بھی چلنا ہوگا میرے ساتھ بیٹے....'' ماں صاحب مسکرادیں۔

''کوئی محرم چاہئے نا.....اور پھر تمہیں بھی تو.....''

''جی ماں صاحب.....میری بھی شدید چاہت ہے..... انشاءاللہ.....''

قیصر کی پڑھائی کا معاملہ نہ ہوتا تو شگوفہ کو بھی لے چلتے....''

خرم نے پراٹھے پر بالائی لگاتی ہوئی شگوفہ کی طرف دیکھا۔

''آپ کا بجٹ ہے اتنا.....؟'' شگوفہ نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

''ہاں... کھینچ کھانچ کے.....اگر بلاوا ہوا تو.....''

''اتنے خرچے کے بعد بھی؟ سب بڑی بڑی رقوم تو نکال لیں ہم نے.....''

''اچھا.....؟'' ماں صاحب نے موٹے چشمے کے پیچھے سے ایک نظر سب کو دیکھا اور ابلی ہوئی لوکی پر چھڑی کی گئی دھنیے کی پتیوں کی خوشبو سے محظوظ ہوکر مسکرادیں اور نمک دانی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔خرم نے نمک ان کی طرف سرکایا۔

''بس ذرا سا.....ضرورت نہیں ہوتی اتنے نمک کی انسان کو....''

''یہ بات ذرا انہیں بھی تو سمجھائے نا.....''

خرم نے شگوفہ کی طرف اشارہ کیا اور مسکرایا۔

''شگوفہ کو.....؟'' ماں صاحب بھی مسکرائیں۔

''کہاں کا شگوفہ ماں صاحب..... یہ تو جانے کب کی پھول ہوگئیں اور وہ بھی سورج مکھی کا.....وہ اس لئے کہ اس سے بڑا کوئی اور پھول نہیں ہوا کرتا غالباً۔''

''قیصر قہقہہ لگا کر ہنسا''

''ہوتا ہے پاپا۔گوبھی کا۔''

اس نے کہا تو ماں نے مصنوعی غصے سے دیکھا۔

''مام....نظر لگا رہے ہیں ڈیڈ آپ کے ڈنر کو.....'' شگوفہ بھی مسکرائی۔

''لگانے دو جی.....ہم پھر بھی وہی کھائیں گے جو جی چاہے گا.....اصل میں خود ان کا جی للچا رہا ہے...ماں صاحب کے ڈر سے نہیں کھا رہے.....''

''مجھے چشمے کے پیچھے سے کچھ زیادہ نظر نہیں آتا....جسے جو چاہے کھا سکتا ہے۔''

سب نے قہقہہ لگایا تو ماں صاحب سر جھکائے مسکرائیں۔

''کبھی کبھی چلتا ہے۔''

انہوں نے پرخلوص سی آواز میں کہا۔

ماں صاحب اور خرم حج سے لوٹے تو شگوفہ اور گھر کا ملازم کئی روز تک مبارک بادیوں کے تقاضوں میں گھرے رہے۔کئی روز تک روزانہ کا شیڈیول متاثر ہوتا گیا۔ہفتوں بعد کہیں کچھ سکون میسر ہوا۔

رات شگوفہ خوابگاہ میں آئی تو خرم میز پر کچھ کاغذ دیکھ رہا تھا۔

''باہر جانا چاہتے ہیں صاحب زادے.....'' انہوں نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

''جی.....کوئی ڈپلومہ ہے دو سال کا اور اس کے بعد اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا انشاءاللہ.....''

''مگر فیس ڈالر، پاؤنڈ یورو میں ہوگی.....پتہ ہے آپ کو۔''

''ہے تو....مگر بچے کا مستقبل بھی تو دیکھنا ہے نا.....اور اگر کم ہو تو وہ پانچ سال والی ایف ڈی میچور ہونے والی ہے۔''

''ہاں ہے تو مگر وہ نومبر میں ہوگی اور رقم مارچ میں چاہئے....میں وہی دیکھ رہا تھا۔''

''اس ایف ڈی پر لون بھی مل سکتا ہے....کچھ انٹریسٹ میں کمی ہو سکتی ہے مگر....''

''توڑا بھی جا سکتا ہے اسے....مگر پھر سارا ہی انٹریسٹ

لوز ہو جائے گا...''

''کوئی اور چارہ بھی نہیں.....'' اس نے شوہر کے چہرے کی جانب دیکھا اور الماری سے رات کو پہننے والا لباس نکالنے لگی۔ دور کوئی کتا زور زور سے بھونک رہا تھا۔

اگلی صبح برآمدے میں ناشتے کے دوران ماں صاحب نے بتایا کہ رات ان کی چھاتی میں ہلکا سا درد اٹھا تھا۔

''کس طرف.....؟ داہنے یا بائیں...'' خرم نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

ماں صاحب نے جب بائیں کہا تو خرم نے چائے کا پیالہ چھوڑ دیا اور کھڑا ہو گیا۔

''آپ تیار ہو جائے..... میں چینج کرتا ہوں.... ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں پوری طرح چیک اپ کرانا ہوگا...''

''ابھی بھی تکلیف ہے.....؟'' شگوفہ نے پوچھا۔

''نہیں....''

''تو پھر کوئی خاص بات نہ ہوگی انشاء اللہ۔ تیزابیت سے بھی بھاری پن ہو جاتا ہے اور دھڑکن تیز اور تکلیف سی محسوس ہوتی ہے.....'' شگوفہ نے کہا۔

''ہاں بیٹا..... پھر بھی..... مجھے ڈر سا لگ رہا ہے۔ نرسنگ ہوم لے چلنا مجھے۔''

''ہاں سب چیک کروائیں گے ماں صاحب آپ فکر نہ کریں.....'' خرم اندر چلا گیا۔

''کچھ نہیں ہوا ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ بلاوجہ۔'' شگوفہ نے سامنے کی دیوار پر اخروٹ کی لکڑی سے منقوش آیت الکرسی کو ابرو اٹھا کر ایک نظر دیکھا اور لمبا سانس لے کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اور واقعی کچھ نہیں ہوا تھا۔ ہر طرح کی جانچ صحیح نکلی۔ سب مطمئن ہو گئے مگر خرم نے محسوس کیا کہ ماں صاحب اکثر و بیشتر کراہتیں ہیں۔ ویسے ماں صاحب کا معمول بھی نہیں بدلا تھا اور صحت بھی ٹھیک نظر آتی تھی۔ وقت سے کھانا پینا بھی ہوتا تھا۔ رات کو آرام سے سوتی بھی تھیں اور رات کی عبادت بھی حسب سابق جاری تھی۔ مگر جب بھی خرم کے کانوں میں ان کے کراہنے کی آواز پڑتی، وہ بے سکون ہو جاتا۔ لپک کر ان کے پاس جا پہنچتا۔ پوری تسلی کرتا کہ سب خیریت ہے۔

''ماں صاب ٹھیک تو ہیں نا آپ..... کیوں کراہ رہی تھی.....؟''

''میں ٹھیک ہوں بیٹا۔ دفتر جا رہے ہو۔ آؤ دعا دم کر دوں۔ پھر میں چاشت میں مصروف ہو جاؤں گی۔''

انہوں نے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا پڑھی۔ ان کے پاس سے گل یاسمین کی خوشبو آ رہی تھی جس سے خرم پچاس سال سے مانوس تھے۔

''جاؤ اللہ حامی و ناصر ہو...''

''ٹھیک ہیں نا آپ ماں صاحب...''

خرم نے باہر کی جانب قدم بڑھانے سے پہلے پوچھا۔

''ہاں بالکل..... بے فکر ہو کر جاؤ.....''

لابی میں لوٹا تو چائے کی پیالی پر بھاپ جیسی کوئی شے نظر نہ آئی۔

''ناشتہ کیے بنا اٹھ گئے.....؟''

شگوفہ نے پیالی ان کے سامنے سے سرکائی اور ٹی کوزی ہٹا کر کیتلی کو چھوا۔ پھر گردن باورچی خانے کی طرف اچکائی۔

''ظفر دوسرا کپ دینا۔'' اس نے ہلکے سے پکارا۔

''گرم ہے.....'' وہ کیتلی سے ہلکا سنہرا گرما گرم اپنی پیالی میں انڈیلنے لگی۔

''لیجئے...''

''گھبرا جاتا ہوں میں.....''

وہ شکر اپنی طرف سرکا کر بولے۔

''بلاوجہ گھبراتے ہیں آپ.....''

''سوچتا ہوں ہمارے لئے کیا نہیں کرتی رہتیں ماں

صاحب..کہیں مجھ سے کوئی کمی نہ رہ جائے..''

''کس چیز کی کمی......وہ ماشاءاللہ بالکل تندرست وتوانا ہیں....''

''مگراس دن کی تکلیف کے بعد کراہتی کیوں رہتی ہیں پھر....؟''

''آپ ہی کی موجودگی میں یہ آواز سننے کوملتی ہے...ورنہ دن بھرتو.......''

''کیاتم روایتی بہوؤں کی طرح......کبھی انہوں نے روایتی ساس جیسابرتاؤ کیاہے تمہارے ساتھ۔''

''آپ یہ الزام نہ دیجئے۔ ساری رات عبادت میں گزارتی ہیں ہمیشہ کی طرح۔ کمرہ ہم سے زیادہ دورتو نہیں۔ جب ان کے درودوتلاوت کہ آواز کانوں میں پڑسکتی ہے تو..؟''

''وہ تو میری کچی نیند کے سبب اونچی آواز میں کہاں پڑھتی ہیں۔؟''

''نہیں....سناتونہیں....شاید.....''

''اگرکراہتیں توآپ ضرور سنتے.....''

''برداشت کامادہ ان میں بہت سہہ لیتی ہوں گی۔''

''پھردن میں کیوں نہیں سہہ پاتیں۔''

''دن میں سب گھر میں ہوتے ہیں، جاگ رہے ہوتے ہیں اسی لئے شاید....''

''ہاں شاید.....شاید یہ ہی بات ہوگی.....''

شگوفہ نے کچھ سوچتے ہوئے سرہلایا۔

''یہی ہوگا....مگرآپ پریشان نہ ہوں...... ماشاءاللہ سے تندرست ہیں.....''

خرم چائے پینے لگا۔ تو ملازم آکر میز کے دوسرے کنارے کے پاس کھڑا ہوگیا۔

''رات میں کیابنے گامیم صاحب.....''

''کیاکھایئے گا...''شگوفہ نے مسکراکر پوچھا۔

''جوآپ کھلایئے گا....''خرم نے سرکاندھے کی طرف خم کیا۔ باہر سے کوئی بانسری بیچنے والاایک پرانی فلم کی دھن بجاتا گزرا۔خرم نے پیالی خالی کرکے پرچ میں ذرااونچی آواز سے رکھی اورنیچی آواز میں گاتاہواکھڑاہوگیا۔

''تن ڈولے میرا من ڈولے میرے دل کا گیا قراررے......'' وہ کمرے کی طرف گیا تو شگوفہ بھی مسکراتی پیچھے چل دی۔

''گوبھی گوشت چلے گا......'' شگوفہ نے مسہری پر رکھی نیلے مہین مہین خانوں والی سفید قمیص کونظر بھر کے دیکھااورالماری سے نیلی ہری آڑی دھاریوں والی ٹائی نکال کرخرم کوپکڑائی۔

''ضرور چلے گا....'' وہ ٹائی باندھنے لگے تو شگوفہ باورچی خانے کی طرف لوٹی۔ ملازم ریفریجریٹر میں سرڈالے۔ 'تن ڈولے' کااگلاحصہ گنگنارہاتھا۔

''میرے دل کا گیا قراررے کون بجائے بانسریا.....''

شگوفہ دروازے کے پاس ذراسا ٹھٹھکی اور کھنکار کراندر گئی۔ ظفر نے ہونٹ سی لئے اورسرباہرنکالا۔

''ادرک ہے ہی نہیں...''وہ جلدی سے بولا۔

''گوبھی گوشت بنے گا...'' اوروہ بلیک بینز بنانا...کالی والی....اورماں صاحب سے پوچھو جاکرکچھ اورلاناہوتو....کچھ کہہ رہی تھیں لانے کوکھیّا کے علاوہ..... پھر جلدی مارکیٹ جاؤ....اوریہ سراتنااندرکیوں ڈالتے ہوعقل مندآدمی.....سبزی والاڈبہ نکال لیاکرو.....اس بہانے دھل بھی جائے گا....''

''کل ہی دھویاتھاخداکی قسم۔''

''اچھااچھاٹھیک ہے۔اب شروع ہوجاناقسم پرقسم....''

شگوفہ باورچی خانے سے باہرنکلی۔

''اب قسم نہیں کھاؤں گا میم صاحب خداکی قسم..... اوہ.....''ظفرنے دروازے تک آکرفوراً کہااورواپس اندرگیا۔

اس شام خرم کچھ دیرسے لوٹاکہ بیٹے کے لئے ٹریولرس چیکس (Traveller's cheque) وغیرہ کا کام تھا۔ شام کوقیصر بھی ان کے ہمراہ گیاتھا۔سب کچھ توقع کے مطابق ٹھیک ہواتھا۔

رات کے کھانے کے بعد ماں صاحب کے کمرے سے کراہنے کی آواز آئی تو خرم بے قرار ہو گیا۔

''ماں صاحب کو پھر تکلیف ہے دیکھتا ہوں....''

وہ اٹھ کر ان کے کمرے کی طرف گیا۔

''سوئے نہیں بیٹا....'' وہ دھیرے سے بولیں۔

''بس سونے ہی والا تھا ماں صاحب....آپ کی طبیعت کچھ خراب لگ رہی ہے....

''میں ٹھیک ہوں....تم کیوں فکر مند ہو جاتے ہو....''

''مگر آپ کیوں کراہ رہی تھیں...؟''

''میں کچھ نہیں...ٹھیک ہوں میں....تم...میں...''

شگوفہ بھی کمرہ میں داخل ہوئی۔

''تم لوگ آرام کرو....کچھ فکر کی بات نہیں....'' ماں صاحب نے گہری سانس لی۔

''بس میرا جی چاہتا ہے کہ.....''

''کیا ماں صاحب...؟''

''ایک بار عمرہ کے لئے جاؤں....''

زاہدہ خانم نے دونوں کو باری باری دیکھا۔

''تو ٹھیک ہے....جیسا آپ چاہیں ماں صاحب...''

خرم فوراً مسکرایا۔

''مگر تمہیں بھی چلنا ہوگا....یا قیصر کو...محرم کے بغیر تو ممکن...''

ماں صاحب نے پھر بہو بیٹے دونوں کو دیکھا۔

''یہ ...یہ...کیسے کرتے ہیں...سوچتے ہیں ماں صاحب...آپ بے فکر ہو کر آرام کریں...کچھ کرتے ہیں...''

شگوفہ نے ماتھے پر ہلکا سا بل ڈال کر شوہر کو دیکھا پھر ماں صاحب کی طرف (بغیر بل ڈالے) بھی۔

''قیصر بھی آ سکتا ہے بیٹا....اس کے امتحان بھی ہو گئے ہیں....، چھ مہینے کے لئے وہ بھی آزاد ہے....آجائے گا ساتھ میرے....مشکلیں حل کرے گا اللہ اس کی...''

''مگر ماں صاحب اسے کوچنگ کا کورس جوائن کرنا ہے....ابھی بچہ ہے انشا اللہ آگے چل کر....کرے گا حج بھی اللہ نے چاہا تو....ابھی اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے...'' شگوفہ نے جلدی سے کہا۔

''ہاں آرام کیجئے ماں صاحب....کچھ کرتے ہیں....''

خرم نے انہیں مصنوعی ریشم کے نرم نرم ریشوں سے بھری گئی ساٹن کے غلاف والی نیلی رضائی اوپر تک اڑھادی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ شگوفہ اس کے آگے آگے تھی۔ کمرے میں پہنچے تو شگوفہ کا سانس پھول رہا تھا۔

''ہانپ رہی ہو تم تو دو قدم چل کر...وزن کم کرلو اپنا شگوفہ بیگم...ورنہ ہمیں ہی کچھ کرنا پڑے گا...ایسے بھی ابھی ہم جوان لگتے ہیں...اور ویسے بھی وہ تمہاری خدمت کرے گی...اور جیسے تیسے میں نبھالوں گا...''

خرم خود کو آئینے میں اور دراصل شگوفہ بیگم کو دیکھ کر مسکرائے جو آئینے کے اندر مسہری پر بیٹھی نظر آ رہی تھی۔

''آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے...؟ ویسے آپ سے کیا بعید ہے...'' اس نے ایک نظر آئینے میں دیکھ کر گردن جھٹکی۔

''اچھا...؟ ابھی بھی شکوک نے پیچھا نہیں چھوڑا آپ کا...کتنے ثبوت دے دیئے ہم نے وفا کے...ہمیں کوئی آپ جتنا خوبصورت نظر نہیں آتا ورنہ....''

''نظر نہیں آتا...کسی اور سے کہئے جا کر...خیر میں سنجیدہ بات کرنا چاہتی ہوں اور آپ....''

''سنجیدہ بات...اچھا اب بتایئے اگر سچ مچ ہی ہمیں وہ آپ کی رشتے کی بہن جس کی ہم نے بھول سے ایک بار تعریف کر دی تھی، پسند آجاتی اور ہم آپ کو آئے دن خدانخواستہ طلاق کی دھمکیاں دیتے رہتے تو آپ کی زندگی تو....''

خرم اپنے بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے بیگم کی طرف پلٹے۔

''جہنم ہو جاتی...ٹھیک سمجھا آپ نے...مگر ہم جہنم میں رہنے کے قائل نہیں...یہ آپ بھی جانتے ہیں.....ہم نے راستے

الگ کر لئے ہوتے...''

شگوفہ بیگم کا لہجہ سخت سا ہو گیا۔

''دیکھئے اس ذکر سے ہی آپ ٹینس ہو جاتی ہیں...خدا کا شکر ہے کہ آپ کا شوہر ایسا نہیں ہے...سوچئے اگر سچ مچ ہی کسی کے ساتھ ایسا ہوتا ہو تو اس کا کیا حال ہو جائے گا...''

''زندہ درگور ہو جائے گی...''

شگوفہ نے پاؤں سمیٹ لئے اور پیچھے ہو کر تکیہ درست کرنے لگی۔

''ہاں آپ نے بالکل سچ کہا...ایسا ہی ہوا تھا...''

''کب...؟ کس کے ساتھ...کس کی بات کر رہے ہیں آپ...''

خرم نے کنگھا میز پر رکھ دیا اور ایک لمبی سانس لیتے اس کے برابر آ بیٹھے۔

خورشید عالم نے گھٹنوں تک آ رہے لمبے سفید جوتے کرسی کے قریب اتار کر اوور کوٹ کرسی کی پشت کو گویا پہنا سا دیا۔ اور چائے کی میز کی طرف دیکھتے ہوئے ایک نظر آتش دان میں سلگتے ہوئے انگاروں کی طرف ڈال کر کھانے کی کرسی پر آ بیٹھتے۔

''تو کوئی فائدہ نہ ہوا تمہیں باہر بھیجنے کا...'' انہوں نے سر جھٹک کر، چائے بناتی بیگم کی طرف نظر اٹھائی اور سامنے کی کرسی پر بیٹھے اپنے صحت مند جوان بیٹے کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔

''نقصان ہی ہوا الٹا...'' بیگم خورشید اُداسی سے بولیں۔

''کہاں کمی رہ گئی ثاقب...قصبے کے اہم اور اکلوتے مشن سکول میں تمہیں تعلیم دلوائی...سینٹ جوزف میں...آکسفرڈ بھیجا...کیوں تمہارا پڑھائی میں دل...''

''آکسفرڈ نہیں کیمبرج اباجی...'' ثاقب جانتا تھا کہ موضوع بدلنے کا یہ ہی یک کارگر طریقہ ہے...''

''دونوں اہم ہیں...کیمبرج اسی کی اصل میں ایک شاخ ہے...اور تم...لندن کی سب سے پرانی یونیورسٹی آکسفرڈ میں جس کے والد نے تعلیم حاصل کی ہو اس کی پہلی اولاد اس عمر تک آ کر بھی چھوٹے بچوں کی طرح پڑھائی سے جی چرائے...اور...''

خورشید عالم پیالی کو چھو کر رہ گئے۔

''کتنی پرانی ہو گی یونیورسٹی اباجی...کوئی...؟''

''لیجئے....یہ موضوع کو کیسے...'' وہ بے بسی سے بیگم کی طرف دیکھ کر بولے۔

''نہیں اباجی میں واقعی جاننا چاہتا تھا...کوئی گیارہویں صدی کہتا ہے کوئی بارہویں...؟

ثاقب بھی ماں کی جانب گویا بے بسی سے دیکھنے لگا۔

''اب جو بھی ہے...کوئی...ابھی پچھلی صدی میں تمہاری پیدائش سے کوئی صدی بھر قبل...یعنی...سن ۱۸۲۳ء میں اس کی یونین...آکسفرڈ یونین بننے کے بعد سے...بننے کے بعد... جانتے ہو بڑے لیڈر اور Noble Laureates پیدا کئے ہیں اس نے...''

''پہلے بہت جھگڑے ہوا کرتے تھے تعلیم کو لے کر وہاں... چرچ کی تعلیم کے خلاف سمجھتے تھے لوگ یونیورسٹی میں پڑھنے کو... اور سٹوڈنٹس کے ساتھ بھی ہوئے تھے نا جھگڑے...؟''

''ہاں... بند ہونے سے بچانا پڑا تھا بڑی مشکل سے منتظمین کو اسے...مگر یہ تو ہمیشہ ہی سماج میں ہوتا ہے...کوئی نئی چیز اپنے ساتھ متضاد خیالات تو لاتی ہی ہے...اور جیت ہمیشہ صحیح بات کی ہوتی ہے...مگر تعجب ہوتا ہے...وہ علمی ماحول...وہ سبزہ زار...وہ چناروں جیسے میپل ٹریز...وہ کشادہ باغات...وہ پرشکوہ عمارتیں...کلس گرجے...راستے...کوئی تمہیں تعلیم کی طرف راغب نہیں کر سکا...کتنا شوق تھا مجھے تمہاری اسناد میں تاج پر رکھی کھلی کتاب کے دونوں صفحات پر مزید دو تاج سنبھالے علم کی دنیا کا وہ بے مثال نشان دیکھنے کا...اپنے جیسا...یا ایسا ہی کوئی اور اہم نشان...ایک پورا شہر...ایک پورا تعلیمی شہر...ایک پوری علمی کائنات بھی تمہیں تعلیم کی طرف راغب نہ کر سکی...اور آخر کار تم نے فیصلہ ہی کر لیا کہ...''

انہوں نے مکھن لگی پتلی سی روٹی کا ادھ چبا ٹکڑا کلے میں

دہائے جواب دیا اور پھر اسے عجلت سے نکل کر بیٹے کی جانب غصے سے دیکھنے لگے... مگر تم... یہ بچوں کے سے سوالات پوچھ کر میرا اور اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو... مجھے یہ بتاؤ کہ یہ اتنی جائداد... یہ امپائر جو میں نے کھڑی کی ہے اسے... اسے کس کو سونپ کر جانا چاہتے ہو تم... وہ دونوں تو بہت چھوٹے ہیں... تم بڑے ہو... کتنی امیدیں وابستہ تھیں تم سے میری...."

انہوں نے گردن خم کر کے ہاتھ میز پر اوندھے رکھ دئے اور بیٹے پر نظریں مرکوز کر لیں۔

"اچھا آپ... آپ کا دل لگتا ہے یہاں... سچ بتائیے ابا جی... میں...."

"نہ لگتا تو میں یہاں آ کر کیوں بس جاتا... گرم خطے کا باشندہ ہو کر بھی... یہ جگہ لندن سے کم نہیں معلوم ہوتی مجھے... یہ ہماری اپنی سرزمین ہے... اور پھر کمی کیا ہے... کس بات کی کمی ہے... ایسے باعزت عہدے پر فائز ہوں... گھر بار زمینیں، باغ سب یہاں ہے... اور یہ سب مجھے ساتھ نہیں لے جانا... اور تم... کیسے سمجھاؤں تمہیں میری سمجھ میں نہیں آتا...."

"مگر مجھے... مجھے... یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا ابا جی... اگر اس سب کو بیچ کر ہم لندن میں بزنیس کریں اور کسی لارڈ کی طرح رہیں..." اس نے بالکل بچوں کی طرح کہا۔

"چپ رہو... میں نے تمہیں اوکسفرڈ کاروبار کے لئے نہیں تعلیم کے لئے بھیجا تھا... میری موت کے بعد ہی... تم... تم ...اور لارڈ... یوں ہی نہیں بن جاتا کوئی... بغیر محنت اور عزت کمائے لارڈ... تم میں یہ دو چیزیں ہیں؟... تم.....؟" خورشید عالم کھانسنے لگے تو بیگم نے غصے سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

"سوری... میں..." اس نے باپ کی طرف نظر اٹھا کر جھکالی۔

"دور ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے... مجھے شک ہے کہ... کہ... وہاں تم...."

وہ کچھ کہتے ہوئے رک گئے اور کمرہ چھوڑ کر جاتے ہوئے بیٹے کی جانب دیکھتے بیگم کی طرف پلٹے۔

"اس نے کہیں شادی تو نہیں کر لی وہاں... میں نے اسے غلط کیا بھیج کر... اس کا تو کبھی تعلیم میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔ یہیں باغ داغ سنبھالتا... اب تو یہ ہاتھ سے نکل ہی...."

"نہیں خدا نہ کرے... کچھ بھی ہو وہ شادی نہیں کر سکتا وہاں آپ کی مرضی کے بغیر... بھانجی میری منگیتر ہے اس کی... جانتا نہیں کیا... آپ بھی کہاں کی سوچنے لگ جاتے ہیں...."

غصے میں... میں... میں کہیں اسے عاق...."

"کیا کہہ رہے ہیں یہ آپ... سن لے گا تو چلا جائے گا ناراض ہو کر... پھر کیا کریں گے اس سب کا... دیوانے ہو جائیں گے ہم دونوں... ابھی بھی باہر جاتا ہے تو کیا میری طرح آپ بھی چپکے چپکے روتے نہیں رہتے...؟ بھوک مر جاتی ہے ہماری... ہول پڑنے لگتے ہیں ہم لوگوں کو... اپنی اولاد آنکھوں سے اوجھل کی جا سکتی ہے اپنی مرضی سے...؟ یہ تو ہم نے اس کی بہتری کے لئے کلیجے پر پتھر رکھ لیا تھا... اب آ گیا ہے تو... مہینوں کے سمندری سفر سے...."

بیگم کی آواز آنسوؤں سے نم ہو گئی۔ خورشید عالم کی آنکھوں میں بھی پانی سا بھر آیا۔ مگر اگلے لمحے وہ پیالی اٹھا کر پرسکون سے چائے پیتے نظر آنے لگے۔

"ٹھیک کہتی ہو... ہماری تو جان ہی اس میں بستی ہے... ہم کیا کر سکتے ہیں... مگر ایک بار اس سے پوچھ لیں کہ کہیں اس نے وہاں کسی سے شادی...."

"آپ کو لگتا ہے کہ ایسا... میں پوچھوں گی... نہیں... پہلے اپنے طریقے سے معلوم کروں گی...."

"جیسے...؟"

"جیسے کہ پیار سے دلار سے... کوئی آپ کی طرح اعلانِ جنگ کر کے نہیں...."

اگلی صبح جب ثاقب گھڑسواری کے لئے باغوں کی جانب نکل گیا تو اس کی والدہ اس کے کمرے سے دھونے والے

کپڑے لینے گئی۔مسہری پر پڑے کوٹ کی جیب سے ایک والیٹ جھانک رہا تھا جس میں اور چیزوں کے علاوہ وہ ایک تصویر بھی نظر آئی۔اس کا حسین وجمیل لڑکا اپنے سے کچھ لمبی لڑکی کے ساتھ کھڑا تھا۔لڑکی کے شانے اس کے کرتی بیٹے کے شانوں سے کچھ زیادہ کشادہ تھے اور کمر تک چست، گھیرے دار گاؤن جیسے لباس میں بھی اس کی کمر کا خم نہایت مبہم نظر آتا تھا۔ جیسے کسی لڑکے کی کمر ہو۔لڑکی کے ہنستے ہوئے دانتوں کے اطراف اس کے چربی سے نابلد چہرے پر دو دو لمبی کمانیں سی بنی تھیں۔سیاہ سفید تصویر میں اس کی آنکھوں کی پتلیوں کی سیاہی نسبتاً کم تھی اور ہلکے رنگ کے ترشے بالوں کے ساتھ میل کھا کر کچھ جاذبیت عطا کر رہی تھی۔

'گورا رنگ تے بلیاں اکھاں۔' بیگم خورشید نے خالص پنجابی لہجے میں گویا اپنے آپ سے کہا۔

'کیا بات نظر آ گئی میرے بیٹے کو...تجھ میں...مگر اس کے باپ نے بھی تو ہمیشہ حسن کا معیار اسی پیمانے سے ناپا تھا....''

انہوں نے سوچا۔

''ہمیشہ کہتے میمیں گوری ہوتی ہیں بہت...مگر انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ حسین ہوتی ہیں...خیر اپنی اپنی پسند...مگر یہ بیٹا میرا...بالکل اچھی نہیں لگتی اس کے ساتھ...گندمی سے ہیں ہم... اور وہ بھی گہرے گندمی نہیں...مگر نین نقش تو ان سے کہیں...مطلب اس سے کہیں اچھے ہیں..اچھے نین نقش وہاں بھی ہوتے ہوں گے...اب اسے یہ ہی پسند آ گئی۔''

وہ ذرا اونچی آواز میں بولنے لگیں۔

''مگر اس کے ابا تو۔''

بیگم خورشید کا دل ذرا سا گھبرایا۔

''اب تو اسے روکنا ہی ہوگا۔''

وہ کچھ اور اونچی آواز میں بولیں۔

''نہیں...ابھی کچھ نہیں بگڑا...منہ پھٹ اور صاف گو بیٹے نے کہہ دیا ہوتا کہ شادی کر لی ہے...ابھی صرف پسند کیا ہوگا....''

باہر سے جمال بٹ کی کلہاڑی کے لکڑیوں پر چلنے کی آواز آ رہی تھی جو بہت سویرے سے چولہے، حمام اور آتش دانوں کے لئے لکڑی کا دوسرا ڈھیر لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔اس بار سردیوں نے بھی طوالت پکڑ لی تھی۔چالیس روز پر مشتمل سردی کے دنوں کا بڑا حصہ ''چلّۂ خورد'' کی سردی میں اس قدر شدت نہیں ہونا چاہئے تھی۔مگر ایسی کوئی بات فی الحال نظر نہیں آ رہی تھی۔

ٹھک ٹھک۔ٹھیک ٹھاک۔ٹھک ٹھک۔

بیگم خورشید کو لکڑی چیرنے کی آواز ہمیشہ اسی طرز میں سنائی دیا کرتی تھی۔آواز کچھ دیر کے لئے بند ہوئی تو ان کے کان باہر کی طرف لگ گئے۔جمال بٹ نے گھاس سے بُنے جوتوں کے اندر بھیڑ کے اون سے کاتے گئے موٹے کپڑے کی چوڑی سی پٹیاں بنالی تھیں اور انہیں اپنے گھٹنوں تک لپیٹ رکھا تھا۔ کلہاڑی کے لکڑی سے ٹکرانے کی ضرب نے بھی زمین پر کانچ کی تختی کی طرح بچھی جمی ہوئی سخت برف کا کچھ نہیں بگاڑا تھا جب کہ کل بھی جمال بٹ اسی مقام پر لکڑیاں چیر تا رہا تھا۔

بیگم خورشید کی آنکھوں میں باہر کا منظر گھوم گیا۔

کانگڑی سینکنے کے بہانے چلم سلگائے گا اب یہ۔اور پھر باورچی خانے کے پچھلے صحن کی صفائی بھی رہ جائے گی۔اگر یہی رفتار رہی جمال بٹ کی تو۔کتنا خراب لگتا ہے جمی برف پر لکڑی کا چورا سا گرا ہوا۔جیسے صفائی ہی نہ ہوئی ہو۔پھر زیبا کتنی مشکل سے سمیٹ پاتی ہے لکڑی کے ڈھیر کی طرح یہ چورا۔بیگم خورشید نے ہونٹوں کو سکیڑ کر دائرہ سا بنایا اور گردن دو ایک بار نفی میں ہلائی۔

کب اٹھائے گا اس ڈھیر کو۔اور برادے کی کوٹھری کے چھجے کی آڑ میں چار چار کر کے تہہ در تہہ لگائے گا۔سوکھنے کے لئے۔یہ کام چور۔اگر اور برف گری تو کہاں چیرے گا لکڑیاں پھر۔سارے شیڈ میں بغیر چیری لکڑیاں بھری ہیں۔برآمدہ تھوڑی تڑوانا ہے۔

بیگم خورشید نے سر جھٹکا تو کلہاڑے کی آواز پھر کانوں میں پڑنے لگی۔اور ساتھ ہی پتھر کی ایک ایک سل سے تراشے

گئے کشادہ زینے پر زیبا کے ننگے پیروں تیز تیز چلنے کی آواز سنائی دی۔یعنی کپڑے لینے زیبا اوپر آرہی تھی۔

ٹھاک ٹھاک۔ٹھیک ٹھاک۔ٹھک ٹھک۔

باہر سے آواز سنائی دی۔

''ٹھیک ٹھاک۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ کچھ نہیں بگڑا....''

ہر حال میں خوش رہنے کو ترجیح دینے والی بیگم خورشید خوش دلی سے مسکرائیں۔

''میں نیچے ہی لا رہی ہوں کپڑے زیبی۔تم مت آؤ....''

انہوں نے پکار کر کہا کہ کون جانے پتنگ ایسی نازک اور ڈورا یسی لچکیلی زیبی، جسے اس کے ساتھ ہاتھ بٹانے والی پہاڑن بی بونے، دھان کوٹتے وقت نظر بچا کر بار بار ثاقب کی کھڑکی کی طرف دیکھتے دیکھا تھا، سچ مچ ہی ثاقب سے بات کرتی ہو اور اسے بتادے کہ میں اس کے والیٹ میں کچھ دیکھ رہی تھی۔

یہ ثاقب میاں بھی اسی کے ہاتھوں کی لسی پسند کرتے ہیں۔کیوں بھولا۔کیا بی بونے سچ کہا تھا۔؟نہیں نہیں۔ایسا نہیں ہوگا...خیر...مگر ایسا ہوگا نہیں۔یہ تربیت نہیں ہے ہمارے بچوں کی۔بیگم خورشید کے ماتھے پر ایک آدھ بل سا کھنچ آیا۔

''اچھا بی بی جی.....''

زیبا نے بھی پکار کر کہا۔اور اس کے ننگے پیروں زینہ اترنے کی تیز تیز آواز آئی۔

بیگم خورشید نے نفی میں سر ہلایا اور ماتھے سے بل یک سر غائب ہو گئے۔

''تیرے سے تو میری زیبی اچھی ہے بے چاری۔جو اس سردی میں ننگے پاؤں کام کرتی ہے میرا تنا۔اس جمال بٹ سے کہوں گی اپنی بیٹی کے لئے بھی بُن دے دو چھوٹے چھوٹے جوتے گھاس کی بل کھائی رسیوں سے۔ پر اِسے تو جیسے سردی نہیں لگتی۔پچھلے دنوں اپنے سلیپر دئے تھے اسے۔جانے کہاں پڑے ہوں گے۔''

بیگم خورشید نے زینے کی طرف نظر ڈالی اور واپس تصویر کو دیکھنے لگیں۔

زیبی سے ہی نہ بیاہ دوں اپنے بیٹے کو۔کاشتکار کی بیٹی ہے۔

یہ ایک جملہ بیگم خورشید نے ہونٹوں سے ادا نہیں کیا۔

''خیر یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

انہوں نے پھر اپنے آپ سے بات کی۔

''یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔بڑے بڑے مسئلے حل کئے ہیں تو نے رشیدہ بانو، اس چھوٹی سی زندگی میں۔اللہ کے فضل سے۔ اب اس کے ابا جی کو یہ بات سنا کر پریشان ہونے سے بچانے کے لئے جلدی سے نسخہ بھی سوچنا اور بتانا ہوگا۔باپ بیٹا دونوں بچے ہیں اس گھر میں۔ایک میں ہی بڑی ہوں۔پیدائشی بڑی۔

''نی مائیں تیری شیداں تو پیدا ہی وڈی ہوئی سی۔''

سیالکوٹ کی پنجابن بیگم خورشید پنجابی میں سوچا کرتیں اور اپنے آپ سے پنجابی ہی بولتیں کہ اور کسی کے ساتھ وہ گھر میں پنجابی نہیں بولتی تھیں۔میاں انگریزی اور اردو بولنا اور سننا پسند کرتے تھے۔کبھی کبھی پنجابی میں گنگنا ضرور لیتے۔بس ایک آدھ مصرعہ۔بیگم کان آواز پر لگا دیتیں کہ ذرا اور گالیں۔مگر وہ ایسے خاموش ہو جاتے کہ صاف ظاہر ہوتا پچھتا رہیں۔لیکن مادری زبان میں سنی لوریاں اور لوک گیت ہی تو ساری عمر یاد رہتے ہیں انسان کو کتنا بھی اردو دان اور انگریز ہو جائے وہ۔ بیگم خورشید نے زیرِ لب کہا اور گنگنانے لگیں۔

''کھیڈن دے دن، چار نی مائیں۔گھر بابل دے مڑ کے نئیں اونا..... بسر گیا بارنی مائیں.... بسر گیا گھر..... کھے اے..اے..اے ڈن دے...کھیڈن دے دن چار نی مائیں۔''

خود باپ بن جانے کے بعد ثاقب خورشید نے اپنے بیٹے کے سامنے یہ نغمہ گنگناتے اور اپنی والدہ کی باتیں کرتے ایک دن بتایا تھا کہ کیسے ابا جی پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور وہ خود ولایت نہیں جا سکے تھے۔اماں جی نے ایک بار پوچھا بھی تھا کہ کہیں وہ مجبوراً تو نہیں رک گئے باپ کو بیمار دیکھ کر، مگر ثاقب نے نفی میں

سر ہلا دیا تھا اور اپنی خالہ زاد سے شادی کر لی تھی۔

''کہ تم کو دنیا میں آنا تھا...'' وہ محبت سے بیٹے کے چہرے کو نہارتے اور اسے مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر گھما دیتے۔ پھر بڑے سُر میں گانے لگتے۔ ایسے ہی جیسے انہوں نے اماں جی سے سنا تھا۔

''کھیڈن دے دن چار... نی... مائیں...''

خالہ زاد سے شادی کرنے کی مجبوری کا دباؤ غصہ ابا جی کی موت کے بعد بیوی پر ظاہر ہونے لگا تھا اور اماں جی کے بعد اور زیادہ شدت سے کہ خرم نے بچپن میں کئی بار انہیں ماں صاحب کو یہ کہتے سنا تھا کہ اچانک سب کچھ چھوڑ کر وہ بہت جلد ولائت جا کر اس فرنگن سے شادی کر کے اسے یہاں لے آئیں گے۔

''اور ماں صاحب اس خوف سے اکثر روتی نظر آتیں۔ انہوں نے ابو کی خوشنودی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ دادی جی نے بھی بتایا تھا۔ وہ آتے تو میرا رونا تک بھول کر ان کی خدمت میں لگ جاتیں۔ حالانکہ ابو میں کوئی خوبی نہ تھی۔ دادا حضور کی جائداد کا انہوں نے بیشتر حصہ فروخت کر دیا تھا اور یہ سلسلہ ان کی زندگی تک جاری رہا۔ ماں صاحب نے کتنے دکھ اٹھائیں شگوفہ بیگم... تم سوچ بھی نہیں سکتیں...'' خرم دراز ہو گئے۔ شگوفہ بیگم آہ بھر کر رہ گئیں۔

''ایسا ہوا ماں صاحب کے ساتھ... اور مجھے کوئی خبر ہی نہیں... کتنے ضبط سے جی ہوں گی ماں صاحب...''

شگوفہ بیگم نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

''اسی لئے تو چاہتا ہوں کہ ہر خوشی ان کے قدموں میں ڈال دوں...''

''ہاں یہ ان کا حق بھی بنتا ہے۔ مگر ابھی اللہ نے دو سال قبل حج کی سعادت عطا کی ہے نا...''

''جانتی ہو... اُس بارگاہ سے کسی کا جی نہیں بھرتا شگوفہ۔ خدا بہتر جانتا ہے جب سے آیا ہوں وہی منظر آنکھوں میں گھوم رہا ہے... آنکھیں بھر آتی ہیں... دل تڑپ تڑپ اٹھتا ہے کہ ایک بار پھر کسی طرح... کسی طرح ایک بار جا کر... جان وہیں نکل جائے میری... سچ شگوفہ یہ تجربہ ایسا روحانی سفر ہے کہ دنیا کے معنی صفر ہو جاتے ہیں... تم گئی ہوتیں تو یہ بات ہی نہ...''

''مگر وقت... حالات... اور حکم بھی یہ ہے کہ فرائض سے سبک دوش ہو کر... اور پھر خود وہاں کی سرکار نے کہلوایا ہے کہ جنہیں اللہ نے یہ موقع نصیب کیا وہ دوسروں کو موقع دیں... بار بار جانے کی جگہ ایک بار جا کر ان کا بھی خیال کریں جو کبھی نہیں گئے... کبھی بھیڑ بھی اتنی ہو جاتی ہے کہ بعض لوگ کچلے بھی گئے ہیں... اور کمزور سی ماں صاحب کی جان... یہ ثواب نہیں کہ کسی اور کو جانے کے لئے رقم دی جائے اگر ایسا ہی ہے تو...؟... یا کسی غریب کی مدد کی جائے۔ کسی یتیم لڑکی کے بیاہ پر خرچ کئے جائیں...''

''یہ عشق حقیقی ہے جناب... عشق نہیں مانتا یہ عقل کی باتیں شگوفہ بیگم...''

''اور اس کے اخراجات... وہ بھی تو ایک پہلو ہے سوچنے کے لئے... جو بچ رہا ہے کہ کہیں بنکوں میں... نکال دیجئے اور ماں بیٹا عمرہ کر آیئے... آگے کا خدا مالک ہے... ہے نا؟''

''تم اس قدر پریشان نہ ہو... ایسا بڑا خرچہ نہیں ہے...''

''مگر کچھ ایسی رقم ہے نہیں... دیکھ لیجئے نا... جا کر... جوائنٹ تو ہے اکاؤنٹ ہمارا... زمینوں کی سالانہ انکم کا زمانہ تو چلا گیا نا... کاروبار ہے نہیں... لے دے کر تنخواہ ہی تو ہے... پھر بچوں کے بڑے ہوتے اخراجات کیسے پر لگاتے ہیں یہ آپ کو بیٹی کی شادی کے بعد بھی اندازہ نہیں ہوا... مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آپ ایسے لاپرواہ...''

''ٹھیک ہے مگر... ماں صاحب کے دن جئیں گی... سوچتا ہوں... ایک پالیسی لی تھی... قیصر کی تعلیم کے لئے... وہ میچور ہونے والی ہے... اور ابھی کوئی اور ایمرجنسی نہیں ہے... میں نہیں جاؤں گا... کچھ دیکھتا ہوں... یہ بھی ضروری ہے... خیر تم خود کو پلیز پریشان نہ کرو... یہ سب میرا ذمہ ہے...''

''آپ کا ذمہ ہے...وقت پر بات سمجھتے نہیں...بعد میں مہینوں بعد کہتے ہیں کہ تم ٹھیک کہتی تھیں...۔''

''وہ تو ہے جناب...۔''

خرم ہنسے اور اٹھ کر غسل خانے میں چلے گئے۔

خرم کے دفتر کے ایک ساتھی اور ان کی بیگم جا رہے تھے۔ محرم کا مسئلہ حل ہو گیا۔

ماں صاحب خوش خرم لوٹیں مگر کمزور ہو گئی تھیں۔

رفتہ رفتہ ماں صاحب اور کمزور ہوتی گئیں۔

ان کے روز و شب حسب معمول ویسے ہی رہے۔صرف بینائی کم ہو گئی تھی۔ایک آنکھ میں موتیاں بند اتر آیا تھا مگر ابھی پختہ نہیں ہوا تھا کہ آپریشن کیا جائے۔گو کہ اب کچھ پہلے بھی آپریشن کیا جانے لگا تھا۔مگر ماں صاحب نے خود ہی کچھ دیر انتظار کرنا مناسب جانا۔

قیصر ولائت چلا گیا تھا۔اور کچھ خوش نہیں تھا۔

''یہاں کے لوگوں کو اپنے علاوہ کوئی دوسرا اپنے ملک میں پسند ہی نہیں ہے...بہت ساروں کو تو مذہب ہی شکایت کا سبب نظر آتا تھا...۔''

''ہاں بیٹا...لیکن آپ کے کالج کی لیول میں تو ایسا نہیں ہونا چاہئے...پھر آپ کوئی نوکری کرنے تھوڑی گئے ہیں... دو سال کی بات ہے...۔''

''ہر جگہ ایسا ہی ہے مام...کہیں کم کہیں زیادہ...میں خوش نہیں ہوں یہاں...۔''

قیصر کی بجھی ہوئی آواز آئی تو شگوفہ کے دل کا شگوفہ یکلخت مرجھا گیا۔وہ خود ضبط کئے بیٹھی تھی کہ قیصر کے جانے کے بعد گھر میں صرف ماں صاحب کے کراہنے کی آوازیں آتیں...کوئی قہقہہ کم کم ہی کانوں میں پڑتا۔خرم بھی خاموش سے ہو گئے تھے اور شگوفہ پر چڑچڑے پن کا الزام تھا۔

''جہاں یہ مہینے گزرے...یہ بھی گزر جائیں گے میری جان...یہ ڈگری تمہارے بہت کام آئے گی یہاں...بس تم وہاں مت رہ جانا دوسروں کی طرح...نہیں تو مر ہی جاؤں گی میں بیٹا...۔''

''نہیں مام سوال ہی نہیں.....میں کسی سہولت کے لئے اپنے وقار سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا...دادی جان کہیں ہیں نا...۔''

''ہاں بیٹا انہوں نے ہی تمہارے اس خواب کی تعبیر یہ نکالی تھی نا کہ تم بہت اونچی تعلیم حاصل کرو گے اور بڑے عہدے پر فائز ہو گے۔''

''ہاں...وہ جب میں نے ایک دن صبح اٹھ کر انہیں خواب سنایا تھا...۔جب میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ میں ایک ہرے بھرے باغ سے گزر رہا ہوں جس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے پودوں کی قطاریں ہیں اور ان پودوں پر زرد رنگ پھول کھلے ہیں اور سارا ماحول خوشبو سے بھرا ہے تو انہوں نے کہا تھا کہ یہ تم نے زعفران کے کھیت دیکھے ہیں اور اتنی اچھی تعبیر نکالی تھی...ہے نا مام...۔''

''ہاں بیٹا...تمہیں یاد بھی کرتی ہیں وہ...کبھی تمہارا نام لے کر بلاتی ہیں اور پھر کسی اور کو بلانے لگتی ہیں...۔''

''آئی مس ہر تو...مگر میں اداس ہو جاتا ہوں...جی کرتا ہے بھاگ کر آ جاؤں...۔''

''نہیں بیٹا...ایسا مت کہنا...۔''

''نہیں ماما...ڈونٹ وری...ابھی نہیں آؤں گا...بس اگلی چھٹیوں میں...یعنی چھ مہینے بعد۔یعنی پچاس بار شیمپو کرنے کے بعد...ہے نا مام...۔''

اس کی آواز میں ہنسی کی گونج سنائی دی تو شگوفہ بیگم کی آنکھیں بھر آئیں۔

''ہاں میرے بچے۔پچاس بار شیمپو کرنے کے بعد...۔''

اس نے آواز کو بھیگنے نہیں دیا۔''

وہ فون کے پاس سے اٹھ کر برآمدے میں آ گئی۔

ناز و نعم سے پلے بچے جانے کن خوابوں کے لئے یا والدین کی خوشی کے لئے وہاں ڈگریاں لینے ٹک جاتے تھے۔ قیصر کہتا تھا کہ وہ ان کے سخت جانی دیکھ کر حیران بھی ہوتا تھا اور

پریشان بھی۔ کبھی جان کا خطرہ، کبھی مال کا۔ اور ہر وقت بے سبب بے عزت ہونے کا نفسیاتی تناؤ۔ شگوفہ برآمدے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگی۔ خرم آیا تو اس نے اس بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا۔

قیصر کی تعلیم زور وشور سے جاری تھی۔ اس کے کھاتے میں بار بار رقم جمع کرنا ہوتی تھی۔ جو دوسرے ملک کی کرنسی میں بدلنے کے بعد خاصی کم ہو جاتی تھی۔ گو کہ اب ڈالر روپے کی نسبت کچھ سستا بھی ہوا تھا۔ مگر پھر بھی وہ بات نہ تھی۔ خرم کا عہدہ مزید اونچا ہو گیا تھا۔ مگر روز روز کی مہنگائی اور عجیب عجیب اخراجات نے کسی قسم کی مثبت تبدیلی محسوس ہی نہ کرنے دی۔

اس دن دیر تک قیصر سے انٹرنیٹ سے رابطے میں بہت سی باتیں ہوئیں تھی۔ شگوفہ اسے ویب کیم میں کبھی ہاتھ دکھانے کو کہتی تو کبھی پیر کبھی سر کے پیچھے بال دیکھنا چاہتی کہ تناؤ سے اُڑتو نہیں رہے۔ اور کبھی ماتھے سے بال پیچھے کروا کر کہ پیشانی ویسی ہی ہے نا جیسے پہلے تھی۔ اور خرم بھی ان سب باتوں سے محظوظ ہوتے رہے۔ کھانے کی میز پر سب ہشاش بشاش لگ رہے تھے۔ قیصر کے جانے کے بعد رفتہ رفتہ گھر کے لوگ اس کی غیر حاضری کو قبول کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔

''میرے پاس کچھ رقم ہے بیٹا... تھوڑی تم مدد کر دو تو... میں عمرہ کر آؤں...''

خرم کھانا ختم کرنے کے بعد بھی میز پر ہی بیٹھا رہتا تھا کہ جب تک ماں صاحب کھانا ختم نہ کر لیتیں۔ میز سے واش بیسن کی طرف جاتی شگوفہ کے قدم پل بھر کو ٹھٹک کر تھم گئے پھر آگے بڑھنے لگے۔ مگر ٹھٹک کر چلنے کے بعد رفتار غیر ہموار سی ہو گئی تھی۔

''ماں صاحب بھی اب...''

خرم اندر آیا تو شگوفہ شب خوابی کا لباس پہن کر مسہری کے کنارے پر بیٹھی تھی۔

''ابھی تک سوئیں نہیں...''

خرم نے بات کاٹی اور الماری کی جانب بڑھا۔

''خرم ماں صاحب کیوں نہیں سمجھتیں ہماری پریشانیاں... کتنے تو لونز لے رکھے ہیں ہم نے بینکوں سے...''

''ہم نے کہاں لئے ہیں... بینک والوں نے دئے ہیں ہمیں...''

''وہ تو ان کا بزنس ہے۔ ہم منع بھی تو کر سکتے تھے نا... خیر اب جو بھی ہے... لونز تو ہیں نا... اور ادا بھی کرنے ہیں... باہر کتنا پیسہ بھیجنا ہوتا ہے... انہیں کوئی...''

''کیوں پریشان ہوتی ہو... یہ معمولی باتیں ہیں... ماں صاحب کوئی غیر تو ہیں نہیں... ان ہی کی دعاؤں کے طفیل گھر پھل پھول رہا ہے۔ جو ہے سب ان کا ہی تو ہے...''

''وہ مگر ہماری ضروریات سے بھی تو واقف ہیں...''

''تو انہوں نے ایسی کون سی بے پرواہی دکھائی ہے... ایک ہی تو شوق ہے ان کا... اور پھر ان کے پاس ہیں پیسے اپنے بھی... میں وہ خرچ نہیں کرنا چاہتا...''

''ہاں جسے وہ صرف خود پر خرچ کرنا چاہتی ہیں...''

''ایسی کوئی بڑی رقم نہیں ہوگی ان کے پاس... تم بھی... اور اگر ہو بھی تو وہ سب ان کا ہے۔ مجھے اتنی بھی سعادت نصیب نہ ہوگی کہ جس ماں نے ہر حال میں گھر کا وقار قائم رکھا۔ ہمیں خود داری سے جینا سکھایا۔ کتنی خوش اسلوبی سے ذمہ داریاں نبھائیں.. میں ان کے لئے اتنا سا کر لوں... ہمارے لئے کیا نہیں کیا انہوں نے...''

''ہاں وہ تو ٹھیک کہتے ہیں آپ... مگر ایک۔ تھوڑا سا کنسرن ہوتا ہے اپنوں کی طرف... انہیں تو جیسے اور کچھ...''

شگوفہ نے اپنی طرف والی میز کی بتی گل کر دی۔

''ایسا نہیں ہے... تمہارا ردعمل زیادہ شدید ہے... وہ بہت کنسرنڈ ہیں اپنی فیملی کے ساتھ... اور کون ہے ان کا ہمارے علاوہ...''

خرم بولتے بولتے غسل خانے کی طرف بڑھا تو شگوفہ کی آواز کانوں میں پڑی۔

''اچھا پھر صحت ان کی دیکھئے... ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو گئی

ہیں...نظر آتا نہیں اچھی طرح...دانت بھی جو بچے ہیں جھول رہے ہیں کیا کھائیں گی...کیسے کریں گی...ہم تو ان کے کھانے کا خاص خیال رکھتے ہیں...."

"اللہ مالک ہے...وہاں سب ملتا ہے...پھر وہ اپنی صحت کا خیال رکھنا ہم سے بہتر جانتی ہیں...."

وہ غسل خانے میں گھس گیا۔

اس بار ماں صاحب نے خود ہی محرم تلاش کرلیا۔انہیں رشتے دار تقریبات میں بڑے اہتمام سے بلا کے لے جاتے تھے۔

"نادرہ کی بیٹی اپنے شوہر کے پاس سعودیہ جارہی ہے...اسی کے ساتھ جاؤں گی میں...اور پھر وہ بھی ساتھ ہوگا...اس کا شوہر عمرہ کے وقت...."

ماں صاحب نے ناشتے کی میز پر گویا خوشخبری سنائی۔

شگوفہ ملازم سے دوپہر کے کھانے کے لئے سمجھا رہی تھی۔

"ظفر دودھ لے آؤ ماں صاحب کے لئے...پہلے...."

خرم نے گردن موڑ کر کہا۔

"چھ مہینے تک رہے گی وہ وہاں...." ماں صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"کون نادرہ کی بیٹی...اور آپ...." شگوفہ نے مڑ کر دیکھا۔

"میں جلدی آجاؤں گی انشاءاللہ...رمضان کے فوراً بعد...."

"رمضان میں بڑی بھیڑ ہوگی وہاں ماں صاحب..." شگوفہ نے پھر گردن موڑی۔

"تو میں کون سا کسی غیر کے ساتھ ہوں گی...نادرہ کی بیٹی ساتھ ہوگی...."

"نادرہ کی بیٹی کا نام کیا ہے ماں صاحب...." شگوفہ نے مسکرا کر پوچھا تو خرم جلدی سے بولا۔

"اس کا نام نادرہ کی بیٹی ہے..." وہ زور سے ہنسا تو سب کی ہنسی میں برابر میں باورچی خانے کے اندر سے ظفر کے ہنسنے کی آواز بھی آئی۔ماں صاحب مسکرائیں۔

"سچ مچ مجھے تو پتہ ہی نہیں....میری بھانجی کی نند کی بیٹی ہے...وہاں سب اس کا ذکر اسی نام سے کرتے ہیں...تو میں...."

"فون پر پوچھتی ہوں ابھی ماں صاحب...آپ فکر نہ کریں...."

سفر کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔حج کے بعد سے ماں صاحب اپنا طواف والا لباس ساتھ رکھا کرتیں تھیں۔کہتیں بلاوا آئے گا تو اسی میں دفن ہونا ہے مجھے۔میری وصیت ہے یہ۔پہلا عمرہ بھی اسی میں ادا کیا۔اس دفعہ بھی یہ لباس ان کے ساتھ تھا۔

کچھ دن بعد ماں صاحب نادرہ کی بیٹی کے ساتھ خیر خیریت سے سعودیہ پہنچ گئیں۔فون پر بات ہوئی تو خوش تھیں کہ صبح زیارت کے لئے جارہی ہیں۔دو دن بعد بات ہوئی تو آواز میں نقاہت صاف نمایاں تھی۔

"میں ...جلدی آؤں گی بیٹا...اگلے بدھ کی فلائٹ ہے..." ماں صاحب نے رک رک کر کہا۔

"مگر آپ...خیریت سے تو ہیں نا ماں صاحب..." خرم کی تشویش بھری آواز ابھری

"ہاں...ٹھیک ہوں میں...آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔"

ماں صاحب کی آواز میں عجب یاسیت تھی۔

"پھر اتنی کمزور کیوں معلوم ہورہی ہیں..." خرم کو خیال آیا کہ ماں صاحب اداس بھی ہیں۔شاید اس لئے کہ اس دفعہ بھی ان کی دلی آرزو پوری نہ ہوئی تھی کہ وہ زندہ لوٹنا نہیں چاہتی تھیں وہاں سے۔

"ٹھیک ہوں بیٹے...."

"ماں صاحب بتایئے نا کیا ہوا...؟" فون کے سپیکرس آن تھے۔شگوفہ نے جلدی سے پوچھا۔

"میں...میں گر گئی تھی..." ماں صاحب کی آواز میں آنسو شامل ہوگئے۔

"کب کیسے...چوٹ تو...کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی...میں..." خرم کی بے قرار آواز ابھری تو دوسری طرف سے

کسی مرد کی آواز آئی ''نہیں فکر کی کوئی بات نہیں ہے...ذرا سا کلائی پر زور پڑا ہے....''

دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''یہ نادرہ کی بیٹی کے شوہر ہونگے....''

شگوفہ نے آہستہ سے شوہر سے کہا۔

''کوئی فریکچر تو نہیں ہے نا...وہ تو درد میں بری طرح بتلا معلوم ہوتی ہیں....''

خرم نے تشویش سے پوچھا تو اس آدمی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''ارے نہیں صاحب ایسی کوئی بات نہیں...ہم نے ڈاکٹر کو دکھایا ہے...ایکسرے بھی ہو گیا ہے....ٹکٹ بھی آ گیا ہے انکا....لیجئے بات کیجئے....''

''کچھ نہیں بس...سوجن ہے کلائی پر بہت....اسی لئے درد ہو رہا ہے زیادہ۔نادرہ کی بیٹی نے بڑا خیال رکھا...لو بات کرو....''

''میں نے خود ٹکٹ بک کروایا ہے ان کا...آپ بس وقت سے انہیں لینے آ جایئے گا....پھر تسلی سے ڈاکٹر کو دکھایئے گا...او کے...؟''

''جی....'' نادرہ کی بیٹی کا شوہر بولا۔

''چلئے تو پھر خدا حافظ....''

''جی اچھا خدا حافظ...''

ایرپورٹ پر دیکھا تو ماں صاحب آدھی رہ گئی تھیں۔اور درد کو بڑے ضبط سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔خرم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ایرلائنز کی خوبصورت وردی میں ملبوس ایک دبلا سا نوجوان ایک بھاری بھرکم ادھیڑ عمر آدمی کو ویل چیئر پر بٹھائے اسی طرف آ رہا تھا۔خرم نے جلدی سے ماں صاحب کی جانب گردن موڑی۔ماں صاحب آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلنے لگی تھیں۔اس نے لپک کر بازو تھام لیا۔اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر سی دوڑ گئی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی خرم نے ماں صاحب کی ایکسرے رپورٹ دیکھی۔ماں صاحب کی کلائی کی دو ہڈیوں میں سے بڑی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور ایکسرے میں صاف نظر آتا تھا۔یعنی اس کو بھی جو ڈاکٹر نہ ہو۔خرم کو پھر تشویش نے گھیر لیا۔وہ انہیں ایرپورٹ سے گھر لانے سے پہلے ہسپتال لے گیا۔وزن میں نسبتاً نہایت ہلکا،عمدہ کا پلستر کروایا گیا اور درد کی گولیاں دی گئیں۔

ماں صاحب تڑپتی کراہتیں سی گھر پہنچیں۔اور دیوار کے سہارے آہستہ آہستہ چلتی سیدھا وضو کرنے چلی گئیں۔پھر کچھ دیر بعد کمرے سے ان کی سسکیاں باہر سنائی دینے لگی۔خرم کچھ مزید طاقت کی دواؤں کے لئے باہر گیا تھا کہ کسی مصدقہ وسیلے سے دوا آئے اور کہیں نقلی نہ ہو کہ نقلی دواؤں کا خفیہ چلن سا چل نکلا تھا۔شگوفہ دروازے تک جا کر لوٹ آئی۔ماں صاحب بلک بلک کر رو رہی تھیں اور بزعم خود چھپ کر رو رہی تھیں۔وہ ان کا بھرم توڑنا نہیں چاہتی تھی۔مگر جب تک ان کے رونے کی آواز آئی وہ بے قراری آس پاس ہی رہی۔

ماں صاحب کے روز و شب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔نہ عبادت میں نہ کھانے پینے کے معمول میں۔کبھی کبھار ان کی کوئی کراہ کانوں میں پڑتی کہ گلے میں لٹکے بازو کے بوجھ سے کمزور سے شانے کا جوڑ دکھنے لگتا تھا۔

پلستر اترا تو ہڈی کچھ ٹیڑھی جڑی تھی۔ہاتھ کلائی سے پیچھے کی طرف بالکل نہ جاتا تھا۔کلائی کا قدرتی خم تبدیل سا ہو گیا تھا۔انگلیوں کے درمیانی جوڑ مستقل طور پر خمیدہ رہتے تھے۔طبی اصطلاح میں اس طرح کا جوڑ کو کھانا کھانے والے کانٹے کی شکل سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔مگر ماں صاحب کو اس کا کوئی ملال نہ تھا۔البتہ ہاتھ کی آزادانہ جنبش سے محرومی سے پریشان سی ہو جاتیں۔درد بھی رہتا تھا۔ہاتھ کو گرم نمکین پانی سے دھوتیں۔اس پر مالش کرتیں۔پھر ذرا راحت ہوتی تو مطمئن سی نظر آتیں۔خرم دیکھتا تو اداس ہو جاتا۔ماں صاحب کے بال بکھرے بکھرے رہتے تھے۔چوٹی بنانے کے لئے دو ہاتھوں کی ضرورت پڑتی ہے اور ماں صاحب کا ایک ہاتھ ٹھیک سے کام نہیں کرتا تھا۔

خرم دفتر جاتے وقت اجازت لینے گیا تھا تو ان کے پاس سے گلِ یاسمین کی وہ مہک بھی نہیں آرہی تھی جو ان کی شخصیت کا حصہ معلوم ہوا کرتی تھی۔ جس کے بارے میں ماں صاحب نے برسوں پہلے کہا تھا کہ پہلی بار خرم کی ابو نے ان کے لئے یہ عطر ایران سے لایا تھا۔ ابو کے تعلق سے ماں صاحب کی واحد مثبت یاد۔ اب ان سے عطر کی شیشی نہیں کھلتی ہوگی۔ خرم سوچتا۔

''ماں صاحب کے بال بکھرے دیکھتا ہوں تو دل دکھنے لگ جاتا ہے۔'' اس نے شام کی چائے کی دوران برآمدے سے باہر کی طرف جانے کہاں دیکھ کر کہا تھا۔

''وقت ہی نہیں ملتا مجھے.... ان کے ہمیشہ سجے سجائے بال دیکھ کر مجھے بھی برا لگتا ہے... جب میں آتی ہوں اس وقت وہ مغرب میں مصروف ہوتی ہیں۔ پھر عشا کی نماز تک جانماز پر ہی رہتی ہیں۔ صبح فجر کے بعد سے بہت دیر تک جانماز پر ہوتی ہیں۔ پھر کچھ وقت آرام کرتی ہیں۔ ادھر میرے جانے کا وقت ہوتا ہے۔ ہفتے کو ہی کہیں وقت مل پاتا ہے مجھے۔ جب جا کر کہیں کر پاتی ہوں یہ سب تھوڑا بہت....''

''ہاں... وہ تو ان کا معمول ہی رہا ہے ساری زندگی...''

''الگ گلٹی فیل ہوتا رہتا ہے کہ مجھے سے کہیں کوتاہی تو نہیں ہوئی.... یہ ہی سوچتی رہتی ہوں....''

''نہیں تم ایسے مت سوچو.... اپنی طرف سے تو....''

''انہیں... سب سے پہلے نادرہ کی بیٹی کے ساتھ جانے کی ضرورت ہی کیا تھی...؟''

''تو پھر کس کے ساتھ جاتیں.... تم بھی حد کرتی ہو شگوفہ....''

''جانے کی ہی کیا ضرورت تھی خرم.... حج بھی کر لیا تھا... عمرہ بھی... پھر ایک اور عمرہ کیا ایسا ہی ضروری تھا... بس ایک ضد سی پکڑ لیتی ہیں بچوں کی طرح....''

''ضد نہیں ہے یہ... بس وہاں مرنے کی دعا مانگتی ہیں... اور اسی لئے لوٹ کر بہت دنوں تک اداس رہتی ہیں....''

''یہ بھی تو ایک طرح کی ضد ہے... خدا انہیں حیات عطا کرے... کون جانتا ہے اپنا وقت... کہ کب جانا ہے... اور....''

''چلو چھوڑو شکر ہے خیریت سے گھر تو پہنچ گئیں... ورنہ....''

''کیا خیریت... زخمی اور اپاہج کر کے بھیجا ہے نادرہ کی بیٹی نے انہیں... اور بجائے پلستر لگوانے کے ٹوٹی ہڈی لئے درد سے بلکتی ہوئی حالت میں روانہ کیا... بے رحموں نے... کتنا درد ہوتا ہوگا... اب خود ٹھیک سے نہاتی دھوتی نہیں... چڑچڑی سی ہو گئی ہیں....''

''انہوں نے زندگی کے ہر سٹیج پر وقار سے جینا سکھایا ہے ہمیں... ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ....''

''کر تو رہے ہیں... بس مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ بھانجی کی نند کی بیٹی کے شوہر کے سہارے گئیں اور کلائی تڑوالی....''

''بس اب بھول بھی چکو یہ سب... سب ٹھیک ہوگا انشاء اللہ....''

''ہاں... انشاءاللہ...''

ماں صاحب کو مٹھی بند کرنے اور کھولنے کے قابل ہونے میں سال بھر کا وقت لگ گیا۔ ان کا سراپا سکڑ سا گیا تھا۔ جسم کی تمام ہڈیوں کی ساخت چھوٹی ہوتی جا رہی تھی۔ ان کا قد شگوفہ کے برابر ہوا کرتا تھا۔ اب کم ہو گیا تھا۔

ماں صاحب پچاسی کے قریب ہو گئی تھیں۔ اب ان کی غذا ذرا زیادہ ہو جاتی تو طبیعت خراب ہونے لگتی۔ کبھی ایک چیز موافق آتی تو کبھی دوسری۔ ادھر ایک منفی بات یہ ہوئی تھی کہ جو چیز انہیں موافق آجاتی، اس کے کم پڑ جانے کی صورت میں انہیں شک گزرنے لگتا کہ گھر کا ملازم بھی کھاتا ہے اور ان کی شکایت وہ وقتاً فوقتاً شگوفہ سے کرتیں۔ دو ملازم اسی سبب نوکری چھوڑ گئے تھے جن میں سے ایک ظفر بھی تھا۔ بڑی مشکل سے شگوفہ نے نئے ملازم کا انتظام کیا تھا۔ یہ باتیں خرم سے کہنے میں اور الجھن ہوتی تھی کہ تھوڑا سا تناؤ بٹ بھی جاتا پھر بھی کوئی فائدہ نہ

ہوتا کہ ماں صاحب اب باتیں بار بار بھولنے لگتی تھیں۔اور اس فراموشی میں کبھی کبھی کھانا پینا بھی شامل ہو جاتا۔شگوفہ نے پریشانی سے سوچا۔اس پریشانی میں دکھ کی آمیزش بھی تھی۔

اس دن شگوفہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی کہ شادی کا البم سامنے آ گیا۔ ہرے لباس اور ہلکے ہلکے زیورات میں ماں صاحب، سرخ جوڑے میں لپٹی بھاری زیوروں سے لدی شگوفہ سے کچھ کم حسین نہیں لگ رہی تھیں۔ بلکہ کسی کسی تصویر میں اس سے کم عمر اور اس سے زیادہ جاذب بھی۔

کبھی ماں صاحب بھی چھوٹی سی لڑکی ہوں گی۔پھر بڑی ہو گئیں اور بدلتی گئیں۔ جیسے لڑکیاں بدل جاتی ہیں۔ بدل دی جاتی ہیں۔بدلتے حالات انہیں بدل دیتے ہیں۔

شگوفہ کی نظریں تصویر میں اپنے مہندی رچے پیروں سے ہوتی ہوئی ادھ کھلے گھونگھٹ تک چلی گئیں۔ جسے ماں صاحب مندی رچے ہاتھوں سے کھول رہی ہیں۔شگوفہ کا چہرہ رو رو کر کچھ سوج بھی گیا ہے مگر میک اپ نہیں اترا ہے۔

کیسے بابل کا گھر چھوٹ گیا تھا اچانک۔

اسے اچانک شدت سے اپنا بچپن یاد آنے لگا۔اس گھر میں اب کوئی نہیں رہتا تھا بھائی کسی دوسرے ملک کا شہری ہو گیا تھا۔ دو چار برس میں کہیں ایک آدھ چکر لگاتا تھا۔اس نے وہاں ایک چوکیدار رکھ چھوڑا تھا جس نے باغیچے کے کونے میں ایک کٹیا سی بنا رکھی تھی۔اور مکان رفتہ رفتہ بوسیدہ ہوتا جا رہا تھا۔وہ سسکیاں لے کر رو دی۔کسی پرانی فلم کا گانا شگوفہ کے ذہن میں گونج گیا۔

اب کے برس بھیج بھیا کو بابل.....ساون میں لیجو بلائے۔

آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ٹھنڈی سانس لے کر اس نے نظریں ماں صاحب کی تصویر پر مرکوز کر دیں۔

ہونٹوں کو دا ہنی جانب خم دے کر مسکراتی ماں صاحب، موجود بیبیوں کی جانب فخر سے دیکھ رہی ہیں گویا کہتی ہوں دیکھو میری پسند۔ان کی ہنستی ہوئی آنکھوں کی چمکتی پتلیوں کے اوپر کی جانب ذرا سے خم کھائے نتھنے میں جگ مگ کرتی لونگ بھی مسکرا رہی تھی۔ شگوفہ کے ذہن میں ماں صاحب کا موجودہ سراپا گھوم گیا۔تصویر میں چہرے کے حسن کو دوبالا کرنے والی مسکراہٹ سے پیدا ہونے والی حسین قوس اب گہری جھری بن کر، جبڑے کے سکڑنے اور دانتوں سے سہارا ٹوٹ جانے کے سبب ہونٹوں کو اور نیچے لٹکاتی چہرے کا سب سے زیادہ غیر جاذب حصہ معلوم ہوتی تھی۔تصویر کے مہندی رچے ہاتھوں میں اب بے شمار چھوٹی بڑی نسیں ابھر ابھر کر وقت کے اپنی رفتار سے چل کر خاموش ستم برپا کرنے کی سنگدل داستاں سنا رہی تھیں۔تصویر میں پہنے، کلائیوں میں پھنسے جا رہے بڑے بڑے دو منقش کڑے اب وضو کے وقت ہاتھ اوپر تک دھوتے ہوئے ماں صاحب کی کہنیوں تک جا کر چپ چاپ لوٹ آتے ہیں۔چتلیوں کی چمک برسوں پہلے کھو گئی تھی۔ بلکہ داہنی آنکھ کے آپریشن کے بعد سے اس پتلی پر ماں صاحب کی آنکھوں کے کمزور پٹھے اپنا قابو کافی حد تک گنوا بیٹھے تھے اور صحت مند آنکھوں میں کتھک کی ہم رکاب رقاصاؤں کی طرح مشترکہ رخ پر تھرکنے والی پتلیاں اب بھینگی ہو گئی تھیں۔دہائیوں سے نتھنے میں پڑی نکی کے دانے۔

جتنی بڑی لونگ کے بوجھ سے نیم بند سا ہو رہا نتھنا اب ان کی شناخت بن گیا تھا۔چہرے پر رفتہ رفتہ بنتی ہوئی جھریاں اب گہرا گئی تھیں۔ان سے پیدا ہونے والی سلوٹوں میں بھی لکیریں پڑ گئی تھیں۔رخساروں کی چربی ختم ہونے سے ڈھیلی پڑنے والی جلد نے ناک کو سہارا دینا چھوڑ دیا تھا اور ناک ہونٹوں کی طرف جھک آئی تھی۔ دانتوں کی غائب ہونے سے مسکراتے وقت ہونٹ دہانے کے اندر گم ہو جاتے تھے اور ناک اور ٹھوری کے درمیان کا فاصلہ نہ ہونے کے برابر ہو گیا تھا۔

شگوفہ نے ایک گہری سانس لی۔

ایسا ہر سن رسیدہ چہرے کے ساتھ ہوتا ہے اسی لئے

بڑھاپے میں لوگوں کی شکلیں ملتی جلتی نظر آتی ہیں۔ گو کہ ماں صاحب کے صاف رنگ اور دبلے سے سراپے کے ساتھ اب بھی ایک الگ طرح کی خوبصورتی اور ایک مخصوص سا وقار جڑا تھا۔ مگر تصویر والی ماں صاحب اور اس وقت کی ماں صاحب دو الگ انسان معلوم ہوتیں تھیں۔

اس خیال کے آتے ہی شگوفہ البم سے نظریں ہٹا کر ذرا پیچھے کو جھکی کہ سنگار میز کے آئینے کے سامنے ہو جائے مگر اسے اپنا چہرہ پورا دکھائی نہیں دیا۔

اب کے برس بھیج......ساون میں لیجو......

وہ دوبارہ تصویروں کی طرف پلٹ آئی کہ بھاری بھرکم بدن سے اٹھ کر آئینہ دیکھنا اتنا ضروری نہ تھا اور دوسرے آئینہ دیکھنے کا خیال بھی کہیں لاشعوری طور پر ابھرا ڈوبا تھا۔

کیوں ہوتا ہے انسان بوڑھا۔

وہ تصویریں پلٹتی رہی۔

اور کیوں بڑھ جاتا ہے اس کا وزن۔ اس کے سامنے ایک اور تصویر کھل گئی جس میں وہ خرم کے ساتھ کھڑی کیمرے میں دیکھ رہی ہے۔ زندگی سے لبریز آنکھوں میں مستقبل کی متوقع مسرتیں لئے اپنے حسن اور کھڑے رہنے کے باوقار انداز سے مکمل واقف۔

زندگی گزارنے میں ہر طرح کے ضابطوں کی پابند ماں صاحب، جب بدل کر ایسی نظر آسکتی ہیں تو شگوفہ ایسے لاپرواہ لوگ کیسے لگیں گے۔ وہ پھر آئینے کی جانب جھکی۔ اس وقت بھی اسے اپنا آدھا ہی چہرہ نظر آیا۔ وہ جلدی جلدی البم پلٹنے لگی۔ ماں صاحب کی اور بھی کئی تصویریں تھیں۔ خورم کے دیوقامت والد کے ساتھ۔ چھوٹے سے خرم کے ساتھ۔ جوان خرم کے ساتھ۔ اور خود شگوفہ اور خرم کے بچوں کے ساتھ۔ ادھیڑ ہورہے بیٹے بہو کے ساتھ ماہم کی شادی کی تصویریں۔ حج کی تصویریں اور عمرہ کی۔

ماں صاحب دھیرے دھیرے بالکل بدل گئی تھیں۔ نہیں بدلا تھا تو ان کے روز و شب کا معمول۔ باغیچے میں کچھ کام۔ مگر پہلے سے کچھ ہلکا۔ عبادت پہلے سے ہی انداز میں ہوتی۔ یعنی شگوفہ کی طرح بیٹھ کر نہیں۔ ہمیشہ کی طرح کھڑے ہو کر اور باقاعدہ رکوع میں جھکنا، دوزانوں بیٹھنا بھی ویسے ہی۔ یعنی سب پہلے کی طرح۔

اب ماں صاحب بچہ سی ہوگئی تھیں۔ بچے کی طرح ناراض اور روٹھنے اور پھر مان جانے والی۔ گویا وہ ایک ضعیف بچہ ہوں۔ اور یہ بات بھی اب گھر کے سب لوگوں کے سمجھنے کی تھی۔ اب وہ جو بات کرتیں عام طور پر ان کی اپنی ہی ضرورت کی ہوا کرتی۔ خوراک، دوائی یا شکائت۔ چھوٹے بچے کی طرح۔ خرم کا مگر اس طرف دھیان ہی نہ گیا تھا کبھی۔ وہ اپنا فرض نبھانے میں خوش ہوتا تھا۔ خود شگوفہ اسے ان کا بزرگانہ بچپن جان کر خوش اسلوبی سے نبھانے کی کوشش کرتی۔

اس دن بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

"ماں صاحب کتنی سیلفش ہوگئی ہیں ماما....."

قیصر نے ماں صاحب کا جملہ سن لیا تھا کہ وہ ابھی بچہ ہے اور انہیں اس کی ٹریننگ سے زیادہ اپنے تیسرے عمرہ کی فکر ہے۔

بھاری بدن کا داہنے بائیں جھکنا توازن سنبھالے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی شگوفہ کے پیچھے پیچھے ہفتہ بھر پہلے لوٹا قیصر بھی کمرے کے اندر داخل ہوا۔

"نہیں ایسا نہیں ہے بیٹا..."

شگوفہ مسہری کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

"تو پھر کیسا ہے مام....سنا نہیں ابھی کیا کہہ رہی تھیں ڈیڈ سے...اب اگر عمرہ کا پروگرام بنا تو میرا تو سال برباد ہوگیا نا.... آئی نیڈ منی ماما.... میں ڈیڈ پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا... ایک اسکالرشپ تو مجھے ملے گا ہی.... پوأر ڈیڈ... پہلے سے انہوں نے

لونز لے رکھے ہیں۔اور پھر کچھ سیونگ بھی تو چاہئے نا...ریٹائر بھی ہونے والے ہیں....''

''تم اس کی فکر مت کرو...وہ سب منصوبہ بند طریقے سے ہورا ہے...اور نہیں ہوگا تمہارا سال برباد انشاء اللہ...دوسرا وظیفہ بھی میرے ذہین بچے کو ہی ملے گا....''

''مگر اب ماں صاحب کو کتنے عمرہ کرنے ہیں مام....یہ تو کوئی حکم نہیں...یہ کیسی عبادت ہے....''

''ایسا نہیں کہتے بیٹا...پھر انہوں نے کیا نہیں کیا ہم لوگوں کے لئے...وہ کوئی غیر تھوڑی ہیں...ہم اپنے ہیں ان کے...کتنے دن رہتے ہیں بزرگ زندہ....''

''کتنے دن...؟...اتنی ہیلدی ہیں وہ اپنی عمر کے لحاظ سے .... ہر چیز میں ڈسپلنڈ...بوڑھے تو آپ اور ڈیڈ لگتے ہیں...شی از ہیپسولیوٹلی فٹ.....اینڈ آئی اپریسیٹ دیٹ آف کورس.... کوئی مدر کی طرح...فیڈل کاسترو کی طرح.... وقت کو پیچھے چھوڑنے والی...وہ تو اچھا ہے....مگر ایسے تو لوگ خود گدیوں تک سے دستبردار ہو جایا کرتے ہیں چھوٹوں کی ضروریات اور خوشیوں کا خیال کر کے سب ان کے حوالے کر دیتے ہیں...مگر ان کے شوق ہی ختم نہیں ہوتے.....''

''یہ شوق نہیں بیٹا...وہ ایک بچے کی طرح ہوگئی ہیں....''

''ہاں صرف اپنی پڑی رہتی ہیں انہیں ہر وقت... بالکل چینج ہوگئی ہیں...آئی کانٹ بی لیو کہ یہ وہ ہی ماں صاحب ہیں جو ہم سے اتنا پیار کرتی تھیں....اب تو انہیں ہماری فکر ہی نہیں....

''اب بھی پیار کرتی ہیں بیٹا...یہ سب بڑھتی عمر کے سبب ہے....''

''خاک پیار کرتی ہیں...آپ کو ان کا اٹیٹیوڈ برا نہیں لگتا...؟''

''لگتا ہے کبھی کبھی۔مگر پھر سوچتی ہوں کہ بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور کئے دن جئیں گی... کوئی حسرت نہ رہ جائے....''

''حسرت...؟...یہ ہر سال عمرہ کریں گی...حج کو جائیں گی اور کبھی ان کی یہ حسرت پوری نہیں ہوگی... کچھ Jealous سی بھی ہوگئی ہیں...اگر انہیں کوئی چیز نہیں چاہئے تو اس کو کریٹسائز کرتی ہیں....''

قیصر نے اپنا سر جھٹکا۔شگوفہ اس کے بالوں کو دیکھ کر مسکرائی۔صحت مند بال لہرائے تھے تو ایک ایک بال ہوا میں الگ الگ اڑتا نظر آیا تھا۔

''نہیں بیٹا...ایسا کچھ نہیں...شی از لائک اے چائلڈ... جسٹ اے چائلڈ....''

''ماں...آپ بچہ نہ کہئے انہیں...یہ لوگ بڑے پریکٹیکل اور میٹر آف فیکٹ ہو جاتے ہیں....وہاں ایک گرینڈ مدر نے اپنی پوتی کا مرڈر کروادیا تھا پتہ ہے....؟''

''ری اے لی....؟''

''ہاں ماما...وہ جاب کرتی تھی تو ان کے پاس اپنے پیسے جمع رکھا کرتی تھی۔اس نے اپنی شادی کے لئے وہ پیسے ان سے مانگے تو انہوں نے نہیں دئے....جھگڑا ہوا لڑکی نے دادی کو پیٹ دیا....''

''ہاتھ اٹھایا دادی پر....؟''

''جی ہاں.... اور پھر دادی نے کسی سے اس کو قتل کروادیا....''

''گڈ گاڈ....مگر...ایسا کیسے ممکن ہے...؟''

''اِٹ از ٹرو مام...اور پھر یہ نہیں کہ سیلف ڈیفینس میں مارا ہوا...جیسے لڑکی نے اٹیک کیا تو انہوں نے اپنے بچاؤ میں یہ فوری قدم اٹھالیا ہو بے سوچے سمجھے...نو...شی پلینڈ اِٹ لائک اے کریمینل...باقاعدہ منصوبہ بنا کر...آپ سوچ سکتی ہیں....؟''

''نہیں... ہاں... یہ تو باقاعدہ کسی مجرم کی طرح... کیا پتہ لڑکی نے اس وقت کہا ہو کہ وہ اس کی جان لے لے گی... جو ہاتھ اٹھا سکتی ہے... جانے کیسی ہو وہ... کیسی تربیت ہو اس کی... دادی ڈرگئی ہوگی کہ اگر وہ اسے نہیں مارے گی تو لڑکی اسی کی جان لے لے گی... مگر پھر بھی جان سے مارنے کا کیسے سوچ سکتا ہے کوئی... اور اپنی اولاد کو ہی... کیا پتہ دادی پہلے سے ہی ایسے کام کرتی ہو اور پکڑی نہ گئی ہو... یا سزا کاٹ چکی ہو... مگر اپنی پوتی...؟''

''وہی تو ماما... اس ایج میں انسان اگر اپنے دماغ اور جسم کو ایکٹو نہ رکھے تو بہت لیزی ہو جاتا ہے... اور دوسروں پر ڈیپنڈنٹ ہونے کی وجہ سے صرف اپنے ہی بارے میں سوچتا رہتا ہے... اسے بس اپنی ہی فکر ہوتی ہے... اور پھر وہ دوسروں سے لاتعلق... اور شدید معاملات میں اتنا خود غرض ہو جاتا ہے کہ جان تک لے سکتا ہے کسی کی...''

''نہیں تم سب کے بارے میں ایسا نہیں کہہ سکتے... یہ انسان کی بچپن کی تربیت پر منحصر ہے... چاہے وہ کتنا ہی بوڑھا ہو... ناراض ہوگا... عاق کردے گا... مگر جان صرف وہی لے سکتا ہے جو اسی نیچر کا ہو... تخت کے لئے لوگوں نے کیا قتل نہیں کروائے...؟ باپ کا قتل کروادیا... بھائی کو مار ڈالا... اب بھی کرسی کے لئے قتل ہوتے ہیں... وہ تو الگ معاملہ ہے... اور پھر وہ جرائم پیشہ ذہنیت ہوتی ہے... کریمنل لوگوں کی بات تو الگ ہے...''

''مگر اس ایج کا انسان... ایک بزرگ...؟''

''کیا معلوم اس کی نفسیاتی حالت کیا رہی ہوگی.... اس عمر میں ذہن کو اگر بیدار نہ رکھا جائے تو Degeneration کی رفتار اور تیز ہو جاتی ہے... پھر اس کا بلڈ پریشر زیادہ ہو... اور کوئی بیماری ہو... یادداشت بھی متاثر ہوتی ہے... اور لیزی ہو جانے والا آدمی اس عمر میں کچھ زیادہ بھولنے لگتا ہے... کئی فیکٹرس ہو سکتے ہیں بیٹا...''

''ہاں یہ بھی آپ ٹھیک کہتی ہیں...''

''پھر بوڑھے اور بچے ایک سے ہوتے ہیں۔ بچوں کو بھی تو اپنی ہی پڑی ہوتی ہے... بھوک لگے تو روتے ہیں... پیٹ بھرے تو ہنستے ہیں۔ کھلونا نہ ملے تو روٹھ جاتے ہیں۔ مل جائے تو مان جاتے ہیں... ان کی ان اداؤں پر ہمیں پیار آتا ہے۔ اور بوڑھوں پر غصہ... جنہوں نے ہماری انہی اداؤں پر ہمیں کبھی کتنا پیار کیا ہوگا... ہم یہ بھول جاتے ہیں...''

اس نے قیصر کے ماتھے پر آرہے بال پیچھے کو سنوارا۔

''شکر ہے کہ اس عمر میں اپنے ہاتھ پیر استعمال کرپاتی ہیں... نہیں تو سوچو ہمیں ہی کتنی پریشانی ہوتی... ہم اولڈ ہوم میں رکھنے والے لوگ تو ہیں نہیں...''

''جی مام... وہ تو ہے... مگر...''

''مگر کچھ نہیں بیٹا... سب ٹھیک ہوگا... چلو... تمہاری پسند کے اچار کے لئے انہوں نے بہت سی سبزیاں منگوائی ہیں... ان کے پاس بیٹھتے ہیں... اور ان کی ہیلپ بھی کرتے ہیں... دیکھو ابھی بھی کچھ نہ کچھ کرتی ہیں... کرنا چاہتی ہیں... انہیں وقت دینا بھی ضروری ہے۔ شی شُڈ ناٹ فیل اَن وانٹڈ... اِٹس ویری امپارٹنٹ...''

''اوکے مام... بے چاری ماں صاحب...''

قیصر دھیمے سے مسکرایا اور ماں کا بازو تھام کر کھڑا ہو گیا۔

''چلئے...''

وہ کمرے سے باہر نکلے ہی تھے کہ خرم داخل ہوئے۔ کشادہ پیشانی پر جو سامنے سے بال اڑنے کے سبب مزید کشادہ نظر آنے لگی تھی، کئی شکنیں ابھری ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا ڈیڈ... آپ بھی پریشان ہیں... ہیں...؟''

قیصر والد کے چہرے کی طرف دیکھ کر مسکراتا ان کے قریب چلا گیا۔

''میں بھی... مطلب...؟... کہو کہ میں ہی...''

بیٹے کے اس محبت بھرے عمل سے پل بھر میں ماتھے کی شکنیں غائب سی ہوگئیں اور وہ بھی مسکرائے۔

''تم لوگوں نے تو اس وقت ان کا یہ برتاؤ دیکھا ہے نا... میں صبح سے اپ سیٹ ہوں....''

''اپ سیٹ ہونے والی کوئی بات نہیں ہوا کرتی اس عمر کے لوگوں کو لے کر... یہ تو بچے ہو جاتے ہیں... مگر ایسا کیا ہوا...؟''

شگوفہ نے مسکرا کر کہا تو خرم بھی مسکرائے۔

''کتنی ذہین ہوگئی ہیں آپ ہماری کمپنی میں...''

''کیا ہوا تھا ڈیڈ...'' خرم باپ کے جملے سے محظوظ ہو کر مسکرایا۔

''صبح میں اتنے اچھے موڈ میں ان کے پاس اپنا خواب سنانے گیا کہ ہمیشہ سے ہم سب ان سے ہی تعبیریں پوچھتے ہیں کہ اچھی تعبیریں سنا کر دل خوش کر دیتی تھیں....''

''تو....؟''

''تو کچھ نہیں... میں تو وہی یاد رکھے تھا کہ ماں صاحب کا کہنا ہے کہ کسی ہمدرد کو خواب سنانا چاہئے کہ سب سے پہلے جو تعبیر کی جاتی ہے... وہی سچ ہو جاتی ہے....''

''وہ تو ڈیڈ ایسے ہی پیار میں کہتی ہوں گی... ایسا سچ تھوڑی ہوگا....''

''اب جو بھی ہو بیٹا... میں نے دیکھا کہ علی الصباح کسی نے ایک رو پہلی کشتی میں بہت سے سرخ سرخ سیب بھیجے ہیں۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ کس نے بھیجے ہیں۔ اور وہ آدمی کہتا ہے آپ کے کسی ہمدرد نے اور چلا جاتا ہے۔ میں خواب میں ہی سوچتا ہوں کہ ماں صاحب کے لئے رکھیں گے کہ اس موسم میں ابھی سیب اتنے سرخ نظر نہیں آتے۔ اور جا کر کشتی ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیتا ہوں... جاگا تو ماں صاحب کو خواب سنایا کہ کچھ اچھی تعبیر سے کوئی امید بندھا دیں گی۔ یہ اتنے سارے لونز... ان بڑے بڑے خرچوں نے تھکا دیا ہے... سب نبٹانے میں سال بھر لگ سکتا ہے... کچھ دل کا بوجھ تو ہلکا ہوگا ماں صاحب کی باتوں سے... بھلے جھوٹی تسلی ہی صحیح... مگر....''

''پھر کیا بولیں ڈیڈ...؟''

''غور سے خواب سنا اور وہ بھی ہمیشہ کی طرح خوش دلی سے نہیں... بڑی سنجیدگی سے... پھر بولیں کہ میرے تو دانت ہیں نہیں جو سیب کھا سکوں....''

شگوفہ اور قیصر زور سے ہنسے۔

''اور آگے بولیں کہ تعبیر اس کی یہ ہی ہے کہ تم مجھے عمرہ کے لئے لے جاؤ گے۔ اور مسکرانے لگیں.. آئی ونڈر... شفیق، محبتوں سے بھری... دوسروں کی خوشی کے لئے اپنی ضرورت کی قربانی پر تیار ماں صاحب کہاں چلی گئیں....''

''پھر آپ نے کیا کہا ڈیڈ...؟''

قیصر نے آنکھیں پھیلائیں۔

''انہوں نے کیا کہا ہوگا میں بتاتی ہوں مگر پہلے آپ لوگ یہ سمجھ لیجئے کہ ماں صاحب کہیں نہیں گئیں۔ بس بڑھاپے نے ممتا کو کہیں دبا دیا ہے... جو کبھی کبھی ابھرتی ہے... کمزور ہوتا ہوا جان وجسم ہر حال میں اپنا دفاع چاہتا ہے... وہ سمجھتی ہیں کہ ان کے علاوہ سب اپنا خیال رکھ سکتے ہیں.... اس میں حیران ہونے والی بات کوئی نہیں۔ ڈوبنے والا پانی سے باہر آنے کے لئے اکثر اسے ہی دھکے دیتا باہر آنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے خیال نہیں آتا کہ خود بچانے والا ہی اس کی اس حرکت سے ڈوب سکتا ہے۔ یا کبھی اگر انسان خطرے میں اچانک گھر جائے تو اس وقت وہ گود کا بچہ پھینک کر جان بچانا چاہتا ہے.... اسے کچھ سیکنڈ کے بعد ہی اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ بچہ کہاں ہے... جب پھر وہ چلاتا ہے کہ میرا بچہ کہاں ہے اور واپس بھاگتا ہے.... یہ ہی بات ایسے معاملوں پر بھی صادق آتی ہے....''

''مگر پھر بھی بھئی... انسان کی کچھ امیدیں وابستہ ہوتی ہیں... اپنوں سے....''

☆☆☆☆☆

بُھول بھُلیّاں

○ پروفیسر معین الدین جینا بڑے
شعبۂ اردو جواہر لال یونیورسٹی، نیو دہلی-۱۱۰۰۶۷

گلی میں کھیل رہے بچوں کے شور اور از خود ورق الٹنے والے البم کی موسیقی نے آپس میں مل کر بابو کھوجی رام پر ایک عجیب کیفیت طاری کر دی تھی، ان کی بوڑھی آنکھوں میں یادوں کے جگنو چمک رہے تھے، ان جگنوؤں کی جلتی بجھتی روشنی میں وہ ٹھہر کر، ماضی کے اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے کافی دور تک نکل آئے تھے اور اب ان کی عمر اپنے اس پوتے جتنی ہو گئی تھی جو باہر گلی میں اپنے ہم سنوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔

ساٹھ باسٹھ برس کا فاصلہ جب مٹ گیا تو انہوں نے اپنی آنکھوں پر بندھی پٹی کھول کر چاروں طرف نظر دوڑائی، گلی کی چہل پہل بدستور قائم تھی، آنے جانے والوں کا سلسلہ جاری تھا، پھیری والے اور خوانچہ فروش آوازیں لگاتے ہوئے گذر رہے تھے، دو ایک کو گلی میں عورتوں نے روک لیا تھا اور ان سے مول تول کر رہی تھیں، ایک بغیر گھنٹی کا سائکل سوار چلا چلا کر راہ گیروں کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا، ادھر سے موٹر کے ہارن کی آواز آئی تو دوسروں کے ساتھ سائیکل سوار بھی ایک طرف کو ہو گیا، سب کچھ پہلے جیسا تھا، بس اتنا فرق ہوا تھا کہ دور دور تک ان کا کوئی ساتھی، کوئی ہمجولی نظر نہیں آ رہا تھا، سب چھپ گئے تھے اور انہیں ان چھپے ہوؤں میں سے کسی ایک کو ڈھونڈ کر چھونا تھا۔

اپنے چھپے ہوئے ساتھیوں کو ڈھونڈ نکالنا کھوجی رام کے لئے کوئی بات نہیں تھی، جب کبھی اس پر داؤ چڑھتا وہ یوں چٹکیوں میں اسے اتار دیتا، بھگوان جانے یہ اس کے نام کی برکت کی وجہ سے تھا یا کھیل کے قاعدوں کی وجہ سے، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کھوجی رام پر داؤں اور اس نے سو کی گنتی کے اندر سے اتارا نہ ہو، اسی داؤ کو اتارنے میں اس کے ساتھی جب کبھی کھوجی رام کی باری آتی تو لڑکوں کا جی چاہتا کہ کھیل کے قاعدوں میں کچھ ترمیم کی جائے اور اگر ایسا ہو سکتا تو یوں ہو جائے کہ ان کی گلی کچھ پھیل جائے.....اتنی پھیل جائے کہ سارا شہر اس کے اندر سما جائے.....کھوجی جیسا ڈھونڈنے والا ہو تو اتنی سی گلی میں چھپنا بھی کوئی چھپنا ہوا، کھیل کا مزہ تو اسی وقت ہے کہ داؤ اتارنے والے کو نانی یاد آ جائے!

داؤ اتارنے کے لئے کھوجی چاروں طرف گھوم کر گلی کا جائزہ لے رہا تھا اور اس کے دوست جہاں کہیں بھی چھپے تھے، دم سادھے دل ہی دل میں گنتی گن رہے تھے، یہ طے تھا کہ سو کی گنتی تک پہنچتے پہنچتے ان میں سے کسی ایک پر داؤ چڑھ چکا ہوگا، ہر لڑکا اپنی خیر منا رہا تھا، چھپنے کا وقت تھا، اب پکڑے جانے کا مطلب تھا رات کے اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے پھرا کریں اور دیر سے گھر جانے کی سزا میں جو پٹائی ہوگی سو وہ الگ!

اکثر یہ ہوتا کہ نوئے پچانوے کے اندر ہی کھوجی پکار کر کسی کے پکڑے جانے کا اعلان کرتا اور باقی لڑکے اپنی اپنی جگہ سے نکل کر باہر آ جاتے، آج یہ ہوا کہ ان میں سے ہر ایک گنتی سو تک پہنچ گئی اور وہ باہر نہیں نکل سکے، کھوجی نے کسی کے پکڑے جانے کا اعلان نہیں کیا تھا۔

اتنی دیر میں کھوجی داؤ نہ اتار سکے یہ ناممکن ہے، یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ اس نے انہیں بے وقوف بنایا ہو، یہ حرکت تو کچے کھلاڑیوں کی ہے کہ جب ان پر داؤ چڑھے تو سب کے چھپ جانے کا انتظار کریں اور پھر چپ چاپ آنکھوں پر بندھی پٹی کھول کر گھر کی راہ لیں، چھپنے والے، چھپے بیٹھے یہ سوچ کر خوش ہوتے رہیں کہ کوئی انہیں ڈھونڈ رہا ہے اور وہ کسی کو پدار ہے ہیں، یہ تو انہیں بعد میں معلوم ہوگا کہ وہ خود پد گئے۔

کھوجی ایسا نہیں کرسکتا، وہ ایک پکا کھلاڑی ہے اور اس کھیل کے تعلق سے کچھ ایسی ازلی مناسبت ساتھ لے کر آیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے، کھیل کے اسرار ورموز از خود اس پر آشکار ہونے کے لئے بے تاب رہتے ہیں، وہ واحد کھلاڑی تھا جسے صرف چھپنے میں نہیں بلکہ ڈھونڈنے میں بھی لطف آتا تھا، اس کھیل میں وہ دونوں رول یکساں دلچسپی اور انہماک سے ادا کرتا تھا، اس کے لئے آنکھ مچولی کے کھیل میں پدنا اور پدانا بے معنی لفظ تھے، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے ڈھونڈنے کے باری سے جی چرایا ہو یا کہ چھپنے کی باری کی طرف اس کے رغبت ظاہر ہوئی ہوئی، سب دیکھتے تھے کہ اسے ڈھونڈنے میں بھی وہی مزا آتا ہے جو دوسروں کو چھپنے میں آتا ہے، چھپنے میں اوروں کے ساتھ اسے مزہ آتا تھا تو کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔

یہی وہ ہے کہ ہر لڑکے کو یقین تھا کہ سب کے چھپ جانے کے بعد چپ چاپ گھر چلے جانے کی حرکت اس سے سرزد نہیں ہوسکتی، یہ ہوسکتا ہے کہ اسے شرارت سوجھی ہو اور اپنی شرارت میں اس نے پکڑے جانے والے لڑکے کو ساجھی بنالیا ہو، کھوجی نے اسے اس بات پر آمادہ کرلیا ہو کہ دونوں خاموش بیٹھے رہیں تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ ڈھونڈے جانے کے شوق میں سب لڑکے کب تک چھپے رہ سکتے ہیں، یہ حرکت کھوجی پہلے بھی دو ایک مرتبہ کرچکا تھا۔

آج ایک مرتبہ پھر ان لڑکوں کو معلوم ہوا کہ جس چھپنے کی باری کی خاطر وہ مرے جاتے ہیں وہ چھپنا کتنا اذیت ناک ہوسکتا ہے، وہ جو کچھ دیر پہلے اس خیال سے مسرور تھے کہ کوئی انہیں ڈھونڈ رہا ہے، اب پریشان ہوگئے تھے کہ کوئی انہیں ڈھونڈ کیوں نہیں لیتا؟ ڈھونڈے جانے کا نشہ اتر چکا تھا، اتنی دیر تک چھپنے رہنے سے ان کی طبیعتیں منقبض ہونے لگیں تو انہوں نے اپنی اپنی جگہ سے کسی آڑ، کسی اوٹ سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی اور جب یہ کوشش سودمند ثابت نہیں ہوئی تو سب کے سب اوٹ سے نکل کر باہر گلی میں آگئے۔ باہر گلی میں شام کے دھندلکے کی جگہ رات کی سیاہی اتر آئی تھی، میونسپلٹی کا بلب ٹمٹمارہا تھا، ساری چہل پہل ماند پڑ چکی تھی، فضا بوجھل ہوگئی تھی اور راستے پر اداسی بچھی ہوئی تھی.....رہا کھوجی تو اس کا دور دور تک پتا نہیں تھا!

کھوجی نے نہ تو اپنے دوستوں کو بے وقوف بنایا تھا اور نہ اس شام اسے شرارت سوجھی تھی، داؤ اتارنے کے لئے چاروں طرف گھوم کر جب اس نے گلی کا جائزہ لیا اور ایک اچٹتی ہوئی نظر بڑی سڑک پر ڈالی تو وہاں سے گذرتے ایک آدمی پر اسے اپنے ماما کا گمان ہوا، اس کے وہ ماما جو کبھی بمبئی نہیں آئے تھے، کھوجی نے دیکھا کہ وہ گلی میں نہیں مڑے بلکہ سیدھا آگے بڑھ گئے، لپک کر انہیں روکنے کے خیال سے کھوجی گلی سے نکل کر بڑی سڑک پر آگیا.....وہ لتاں کی اس تاکید کو بھولا نہیں تھا کہ کھیل کود کے دوران کبھی گلی سے باہر قدم نہ نکالے.....لیکن اسے اماں کی یہ بات یاد تھی کہ اس بمبئی کی بھیڑ میں بچے تو بچے بڑے بھی کھوجاتے ہیں، پردیس میں ماما کے کھوجانے کا اندیشہ اس کے ذہن پر کچھ ایسا حاوی ہوا کہ اس نے سوچا بھگوان نہ کرے اس بھیڑ میں ماما کھوگئے تو اس کی ذمہ داری اس کے سر ہوگی۔

بڑی سڑک پر آکر اس نے ماما کو آواز دی لیکن سڑک کے شور میں شائد اس کی آواز ان تک نہیں پہنچی، وہ برابر آگے بڑھتے رہے، انہوں نے مڑکر دیکھا تک نہیں، کھوجی نے سوچا ذرا سا تو

فاصلہ ہے ابھی دوڑ کر انہیں روک لیتا ہوں، وہ بھیڑ کو چیرتے ہوئے ان کی طرف بڑھنے لگا، لوگوں کو ہٹاتے اور موٹروں سے بچتے بچاتے انہیں جا لینے کی کھوجی کی تمام تر کوشش کے باوجود اس کے اور ماما کے بیچ کا فاصلہ مستقل بڑھتا رہا، اس کوشش میں وہ اپنے گھر اور گلی سے بہت دور نکل آیا اور اسے اس بات کا بھی دھیان نہیں رہا کہ وہ بڑی سڑک کو کب کا چھوڑ چکا ہے۔

انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں اس کے ماما کی حیثیت ایک تنکے کے سی تھی، وہ تنکا اس سمندر کی پرشور موجوں پر ہچکولے کھا رہا تھا اور کھوجی اس پر نظریں جمائے ہوئے تھے، اس ڈوبتے ابھرتے تنکے کو دیکھتے دیکھتے ایک پل کے لئے کھوجی کو ایسا لگا کہ وہ خود اس سمندر میں ڈوبا جا رہا ہے، دوسرے ہی پل اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑی موج آئی اور اس میں وہ تنکا ایسا ڈوبا کہ پھر ابھر نہ سکا!

تنکے کے ڈوبنے نے کھوجی کو اپنے ڈوبنے کے احساس سے نجات دلائی، اس نے ٹھہر کر سانس درست کیا، خود اپنا جائزہ لیا تو دیکھا کہ وہ پسینہ پسینہ ہو رہا ہے، اپنے اطراف نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ وہ شہر کے کسی انجانے چوراہے کے بالکل بیچ میں کھڑا ہے.....چشم زدن میں اس پر روشن ہوا کہ وہ کھو گیا ہے!.....تو آخر وہ ڈوب ہی گیا!!

ان دنوں بمبئی میں ٹرینیں نہیں چلا کرتی تھیں، سڑک پر ان کے لئے لوہے کی پٹریاں ڈال دی گئی تھیں، اوپر برقی تار جھول رہے تھے جن سے ٹرام جڑی رہتی تھی، وہ شائد ٹرام کے وہاں سے گذرنے کا وقت نہیں تھا، بسوں، موٹروں اور سائیکلوں سے البتہ چاروں راستے پٹے پڑے تھے، تمام سواریوں کی رفتار میں ایک تال میل تھا، پیدل چلنے والوں کی بھیڑ الگ تھی، مختلف عمروں کے مردوں اور عورتوں پر مشتمل تھی وہ بھیڑ، اس میں بعضوں کے ساتھ ان کے بچے بھی تھے، وہ سب ان سواریوں سے بے نیاز اپنے اپنے راستے، چلے جا رہے تھے، ویسے ہی جیسے وہ سواریاں، ٹرام کی لوہے کی پٹریوں سے بے نیاز فراٹے بھر رہی تھیں، ایسا لگتا تھا کہ ان سبھوں کو بڑے سلیقے کے ساتھ سدھایا گیا ہے، کسی کی کسی سے ٹکر نہیں ہو رہی تھی، جبکہ ٹکرا جانے کے امکانات قوی تھے، سب سہج سبھاؤ سے چلے جا رہے تھے، گویا ہر چیز اپنے معمول پر تھی، سوائے اس کے.....ہر چیز اپنے محور سے بندھی ہوئی تھی اور اس کی گردش کا رستہ طے تھا، سوائے اس کے کہ وہ کھو گیا تھا!

لوگوں کا وہ ہجوم دیکھتے دیکھتے کئی ریلوں میں بٹ جاتا اور کچھ دیر میں الگ الگ سمتوں سے کئی ریلے آ کر پھر سے ہجوم بناتے، کبھی کبھی دو ریلے آمنے سامنے ہو جاتے تو وہ آپس میں بڑے عجیب ڈھنگ سے گتھ جاتے، ذرا سی دیر میں معلوم ہوتا کہ دونوں نے ایک دوسرے کو پار کر لیا ہے، لیکن وہ تو اپنے محور ہی سے دور جا پڑا ہے وہ بھلا کس کے مقابل ہو سکتا ہے؟

تا دیر مستقل طور پر ڈوبتے ابھر تنکے کے تعاقب کی وجہ سے اس کی نظر دھندلا گئی تھی اور یہ منظر اس کے لئے ایک پراسرار کیفیت کا حامل ہو گیا تھا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ایک مہین چادر اس پورے منظر پر تان دی گئی ہے اور اس چادر سے منظر کے اسرار ایک ایک کر کے چھن رہے ہیں.....سچ تو یہ ہے کہ اس کی دنیا ہی بدل گئی تھی.....اور یہ اسی پل بدل گئی تھی جس پل اس پر یہ بات کھلی تھی کہ وہ کھو گیا ہے!

اس ننھی سی عمر میں شعوری طور وہ ان باتوں کو سمجھتا لیکن واقعہ یہ کہ اس نے خود کو کھو کر جسے پایا تھا اس ایک پل کے لئے اس نے اپنے اندر ایک عجیب اپنا پن محسوس کیا تھا۔

وقت گذرتا رہا لیکن وہ ایک پل کہیں اس کے اندر ٹھہر سا گیا!

کھو جانے کے باوجود وہ طمانیت کے احساس سے بھرا ہوا تھا، اسے کھونے کا مطلق غم نہیں تھا لیکن جب اسے اماں کی یاد آئی اور خیال آیا کہ اب وہ انہیں مل نہیں پائے گا تو بے اختیار اس کے آنسو نکل پڑے، آنسو پونچھنے کے لئے اس نے ابھی

ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ.....گلی سے آرہی رونے کی آواز اور دادا دادا کی پکار نے ان ہاتھوں کو روک لیا!

بابو کھوجی رام ایک زقند بھر کے دوبارہ وقت کے دھارے سے آملے، البم کی چابی آخری ورق پر آکر ختم ہوگئی تھی، اس آخری ورق پر ان کی اپنی تصویر لگی ہوئی تھی، ملازمت سے سبکدوشی کے بعد الوداعی تقریب کی تصویر تھی وہ، اس کے ساتھ ہی صبح کا دیکھا ہوا اخبار رکھا تھا اور سامنے سے ان کا پوتا روتا ہوا آرہا تھا۔

آج صبح اخبار میں اپنے پوتے کی عمر کے ایک گم شدہ بچے کی تصویر دیکھ کر انہیں یاد آیا تھا کہ ساٹھ برس قبل جب پہلی مرتبہ ان کے ساتھ واقعہ پیش آیا تھا اس دن آج ہی کی تاریخ تھی، اپنے حافظے کو جانچنے کے خیال سے وہ بچپن کی اس تصویر کو ڈھونڈ رہے تھے جس کی پشت پر بابو جی نے اس کے نام اور پتے کے ساتھ کھو جانے کی تاریخ لکھ رکھی تھی، ہوا یہ تھا کہ بابو جی اس تصویر کو لئے پولیس اسٹیشن کی طرف جارہے تھے کہ راستے میں وہ انہیں روتا ہوا مل گیا تھا.....جیسے اچانک غیر متوقع طور پر وہ کھو گیا تھا ویسے ہی اچانک غیر متوقع طور پر وہ مل بھی گیا تھا!!

اس اتفاق پر سبھی حیران تھے اور اماں تھیں کہ خوشی سے پھولے نہیں سمارہی تھیں، انہوں نے اسے سینے سے لگا کر چمکارتے ہوئے جب پوچھا کہ بیٹا تو کھو کیسے گیا تھا؟ تو اس نے انہیں بڑی سڑک پر ماما کو دیکھنے اور ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہنے کی تفصیل بتائی تھی، اس پر اماں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

''بیٹا! میری دادی کہا کرتی تھی کہ دنیا میں ایک صورت کے تین آدمی ہوتے ہیں، یہ دھرتی اتنی وشال ہے کہ ایک صورت کے دو آدمی آپس میں مل نہیں پاتے، اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ ایک صورت کا ایک ہی آدمی ہوتا ہے بیٹا! وہ تیرے ماما نہیں تھے، ان کی شکل تیرے ماما سے ملتی ہوگی، آئندہ یاد رکھنا کبھی کسی کی صورت دیکھ کر دھوکے میں مت آنا''

اس نے اماں کی بات گرہ میں باندھ لی تھی لیکن وہ ایک پل جو اس کے اندر کہیں ٹھہر گیا تھا، ہر پل خود کو دہرانے کی فکر میں لگا رہتا تھا، جس کی وجہ سے گھر والے تو گھر والے، گلی محلے والے بھی اس کے تعلق سے پریشان اور فکر مند رہنے لگے تھے، سال میں دو ایک مرتبہ یوں ہی اتفاقیہ طور پر کھوجی کی زندگی کا معمول بنتا جارہا تھا، وہ تو خیر تھی کہ وہ اتفاقیہ طور پر مل بھی جاتا تھا، لیکن جیسے جیسے وقت گذرنے لگا اور کھوجی کی عمر بڑھنے لگی ماں باپ کے اندیشوں کی نوعیتیں بھی بدلنے لگیں، اب بابو جی بے بات اس پر بگڑنے لگے تھے، ایک مرتبہ انہوں نے جھلا کر، اسے ڈپٹ کر پوچھا تھا:

''تو بار بار کھو کیوں جاتا ہے''

اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا، اس کی خاموشی پر وہ اور بگڑے تھے، بگڑ کر انہوں نے دوسرا سوال داغا تھا۔

''تجھے کیا مل جاتا ہے اس بار بار کے کھونے میں؟''

اس کے پاس اس کا بھی جواب نہیں تھا.....وہ بابو جی کو کیسے سمجھاتا کہ کھونا اپنے آپ میں ایک پانا ہے!

اب اس کے چھوٹے بھائی بہن اتنے بڑے ہوگئے تھے کہ اس کی زندگی کے اس معمول سے وہ بھی اپنی بساط بھر واقف ہونے لگے تھے، ان کی آپس کی بات چیت اور ہنسی مذاق میں حوالے کے طور پر کبھی کبھار اس کا ذکر بھی آنے لگا تھا، ایک مرتبہ اس کے چھوٹے بھائی نے اپنی دیدی دے پوچھا:

''دیدی! بمبئی میں اتنی بھیڑ کیوں ہے!''

تو اسے دیدی نے جواب دیا تھا:

''یہ ساری بھیڑ ہمارے بھیا کے کھونے کے واسطے جٹائی گئی ہے''۔

گھر والوں کی ہر ممکن کوشش کے باوجود بمبئی کی یہ بھیڑ بار بار بھیا کے کام آنے سے باز نہ آئی تو انہوں نے بھیا کے پیروں ہی میں بیڑیاں ڈال دی.....بڑی دھوم دھام سے اس کا بیاہ کر کے، بہو گھر لے آئے کہ اب یہ کھونٹی سے بندھا رہے

گا! کم از کم اماں تو یہی سمجھتی تھیں لیکن بابو جی اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھے، ان کی سوچ ذرا الگ تھی، وہ سوچتے تھے کہ آج جب یہ کھو جاتا ہے تو گھوم پھر کر ہمیں مل جاتا ہے، کل کو اگر ہم نہ ہوئے تو کھونے کے بعد یہ کسے ملے گا؟ کھونے کے بعد دوبارہ ملنے کے لئے کسی کا ہونا ضروری ہے، کافی غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس ضرورت کو صرف بہو ہی پورا کر سکتی ہے!

کچھ دنوں کے بعد باتوں باتوں میں اماں نے بہو کے سامنے اس کے کھونے کے معمول کا ذکر کر دیا، ابھی اس غریب کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں چھوٹی تھی کہ اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی، ڈاکٹر نے خواب آور گولیاں تجویز کی، اب یہ ہونے لگا کہ رات میں وقت بے وقت وہ ہڑبڑا کر نیند سے جاگ اٹھتی اور اندھیرے ہی میں ساتھ والے بستر کو ٹٹول کر دیکھ لیتی کہ وہ کھو تو نہیں گیا۔

اس کی بیوی نہیں جانتی تھی کہ وہ یوں راتوں کو پراسرار طور پر غائب نہیں ہوتا، وہ تو بڑے ہی فطری انداز میں سج سجاوے سے کھوتا آیا ہے.....لیکن وہ یہ بات اپنی بیوی کو کیسے سمجھاتا!

کچھ دنوں میں اس کی بیوی اس بات کو خود ہی سمجھ گئی، ویسے بھی وہ بڑی سمجھدار عورت تھی، اپنی گرہستی جمانے میں اس نے جس سلیقے اور اسے چلانے میں جس سگھڑاپے کا مظاہرہ کیا تھا وہ اسی کا حصہ تھا، اس کے اس سلیقے کو دیکھ کر کھو جی کے ماں باپ نہال ہو گئے تھے۔

اس نے آ کر گھر کی کایا ہی پلٹ دی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پانچ برسوں سے ایسا لگ رہا تھا کہ کھو جی کا معمول پرانی بات ہو کر رہ گیا ہے.....لیکن ایک دن بہو اپنی ساس سے کہہ رہی تھی "ماں جی! جیسا آپ بتاتی ہیں وہ کھونا تو پھر بھی ٹھیک تھا، کھو گئے.....پھر مل گئے، لیکن اب تو انہوں نے کھونے کا ڈھنگ ہی بدل دیا ہے"

بوڑھی ماں لرز کر رہ گئی تھی۔

"وہ کیسے بیٹی؟"

"کیا بتاؤں ماں جی! اب تو یہ آٹھوں پہر کھوے کھوئے رہتے ہیں۔"

اماں نے اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا اور بہو کی طرف ترحم آمیز نظروں سے دیکھ کر، مجرم کی طرح پلکیں جھکا لی تھیں!

اماں کے خیال نے بابو کھو جی رام کو بچپن کی وہ بات یاد دلا دی جسے انہوں نے کبھی گرہ میں باندھ لیا تھا، ان کی نظریں سامنے پڑے البم کے آخری ورق پر جمی ہوئی تھیں، وہ سوچنے لگے اگر دنیا میں ایک شکل کے تین آدمی ہوتے ہیں تو اس صورت کے بھی ہوں گے، یہ کیوں کر ہوا کہ انہوں نے اماں کی بات کو گرہ میں باندھ کر بھلا دیا، کبھی اس پر غور نہیں کیا، جبکہ زندگی میں چار چھ مرتبہ خود ان کے ساتھ یہ ہوا کہ کسی اجنبی سے ان کا تعارف ہوا اور اس نے چھوٹتے ہی یہ بتایا کہ ان کی صورت اجنبی کے کسی دوست یا عزیز سے ہو بہو ملتی ہے۔

وہ حیران تھے کہ جدید ایجادات کی وجہ سے یہ دنیا سمٹ کر سمٹا کر بہت چھوٹی ہو گئی ہے لیکن پھر بھی یہ اتنی بڑی ہے کہ ایک شکل کے دو آدمی آپس میں مل نہیں پاتے، ایسا آدمی مل جاتا ہے جو الگ الگ جگہوں پر، الگ الگ وقتوں میں دونوں سے مل چکا ہو لیکن ایک وقت ایک جگہ، دو ایک جیسے آدمی نہیں مل پاتے، کیا وجہ ہے کہ اتفاقیہ طور پر ہی سہی وہ کبھی آمنے سامنے نہیں ہوتے، اس اتفاق کے امکانات کو ختم کرنے کے لئے قدرت نے نہ جانے کیوں کر ہوا کہ وہ زندگی بھر کھوتے آئے ہیں لیکن یہ نہ ہوا کہ کسی بار اتفاق ہی سے اپنے کسی ہم شکل سے ٹکرا جاتے!

باہر گلی میں بچے اب بھی آنکھ مچولی کھیل کھیل رہے تھے، کھیل میں ان کا پوتا بھی شریک تھا، بچے اس سے بے نیاز تھے کہ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے، بابو کھو جی رام کو البتہ یہ احساس ضرور ہوا وہ کھوئے بیٹھے رہے اور ان کے معمول میں فرق آ گیا، یہ وقت تو شام کی سیر کا ہے، اس وقت انہیں کارپوریشن کے گارڈن کی بینچ پر ہونا چاہئے تھا، ان کے بچپن میں یہ گارڈن نہیں تھا، اس جگہ کھلی زمین پڑی تھی، جس پر سنتے تھے کہ مداری اپنا بندر نچاتا ہے، جگہ ویسے دور نہیں تھی، گلی سے

نکل کر بایاں موڑ مڑ کر بڑی سڑک پر بیس بائیس قدم چلنے جتنا فاصلہ تھا، اس وقت تو عمر وہ تھی کہ اس فاصلے کو تین چار چھلانگوں میں طے کر لیتے لیکن اماں نے تاکید جو کر رکھی تھی کہ کبھی گلی سے باہر قدم نہ رکھنا، آج اس فاصلے کو طے کرنے میں آدھا گھنٹہ لگ جاتا ہے، دس پندرہ منٹ بیچ پر ستانے کے بعد جب وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو ان کی ہڈیاں کڑکڑا کے رہ جاتی ہیں، ڈاکٹر کہتا ہے کہ اس عمر میں جسم کے لئے اتنی ورزش ضروری ہے ورنہ تو وہ دہلیز سے باہر قدم نہ نکالتے۔

دیر ہی سے سہی معمول کو پورا کرنے کی خاطر بابو کھوجی رام نے اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں میں چھڑی سنبھالی، ناک پر عینک کو جمایا اور باہر گلی میں نکل آئے، وہ بڑی سڑک کی طرف بڑھ رہے تھے کہ پیچھے سے ان کے پوتے نے آواز دی:

"داداجی آج آپ دوسری بار سیر پر جا رہے ہیں۔"

"دوسری بار کیا مطلب؟"

"کچھ دیر پہلے تو آپ گئے تھے۔"

"کب؟"

"جب میں داؤ اتار رہا تھا۔"

"کہاں گیا تھا میں؟"

"آپ گلی سے نکل کر بڑی سڑک پر ادھر مڑ گئے تھے۔" پوتے نے دائیں موڑ کی طرف ہاتھ دکھا کر کہا۔

"لیکن میں تو روز بائیں طرف مڑتا ہوں، گارڈن کی طرف!"

"میں نے دیکھا آج آپ اس طرف مڑ رہے تھے۔"

اس نے پھر دائیں جانب اشارہ کیا۔

"کیا اب بھی تم پر داؤ چڑھا ہے؟"

"نہیں، اب میری چھپنے کی باری ہے۔"

چھپنے کی خوشی میں لڑکے نے مسکرا کر پلکیں جھپکائیں، بابو کھوجی رام نے پوتے کو سمجھاتے ہوئے کہا:

"دیکھو! باری چاہے چھپنے کی ہو یا داؤ اتارنے کی، سب کچھ بھول کر اسے اتارنے میں من لگانا چاہئے۔"

"داؤ چڑھ جائے تو سبھی اتارتے ہیں لیکن چھپنے کی باری کیسے اتاری جاتی ہے۔"

"ڈھونڈ کر"

"چھپ کر........."

"پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں"

"سوچو مت، جاؤ چھپ جاؤ تمہارے سب دوست چھپ چکے ہیں۔"

گلی اب بھی وہی تھی جو ساٹھ باسٹھ برس پہلے ہوا کرتی تھی آنے جانے والوں کا سلسلہ جاری تھا، پھیری والے اور خوانچہ فروش آوازیں لگاتے ہوئے گذرتے رہتے تھے، راہ گیروں اور سائیکلوں کی بھیڑ میں اسکوٹریں اور موٹریں بھی شامل ہوگئی تھیں، آنکھ مچولی کا کھیل اب بھی کھیلا جارہا تھا، سب لڑکے چھپ چکے تھے اور ڈھونڈنے والے لڑکو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کسے ڈھونڈ نکالے گا۔

بابو کھوجی رام آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے وہاں تک آگئے جہاں گلی دائیں بائیں مڑ کر بڑی سڑک سے مل جاتی ہے، پیچھے مڑ کر انہوں نے ایک بھرپور نظر ڈالی، پھر پلٹ کر پہلے دائیں اور پھر بائیں جانب دیکھا، بڑی سڑک اب نام ہی کی بڑی رہ گئی تھی، باوجود اس کے کہ ان برسوں میں کارپوریشن نے دو ایک مرتبہ سڑک کے کنارے بنی غیر قانونی تعمیرات کو توڑ کر اسے چوڑا بھی کیا تھا، وہ کچھ سمٹی سکڑی سی معلوم ہو رہی تھی، اس کے سرے البتہ اب بھی نظر نہیں آرہے تھے، جہاں تک نظر نے ساتھ دیا پہلے کی طرح اب بھی یہی نظر آیا کہ بس سڑک چلی جارہی ہے، دائیں طرف بھی سڑک ہی سڑک تھی اور بائیں طرف بھی سڑک ہی سڑک.........!

بابو کھوجی رام نے جب چھڑی پر اپنی گرفت مضبوط کی اور دایاں موڑ مڑ گئے تو پیچھے گلی میں شام کے دھندلکے کی جگہ رات کی سیاہی اتر آئی اور کارپوریشن کے کھمبے سے ٹنگا ٹیوب ٹمٹمانے لگا!!

□□□

غزلیں

ڈاکٹر ظفر اورآبادی

حال اپنا کیسے قید میں رہ کر سنوارتے
بھرتے اگر اڑان تو شہپر سنوارتے

کچھ روشنی کا ذائقہ چکھتی اندھیری رات
جگنو ہی بن کے آپ جو منظر سنوارتے

فطرت صبا مزاج کسی کی نہ تھی یہاں
گلشن میں ایک پھول بھی کیونکر سنوارتے

محفل میں جن کے لب پہ اُجالے تھے امن کے
تنہائی میں ملے وہی، خنجر سنوارتے

الجھے اگر نہ ہوتے مسائل کی بھیڑ میں
ہم بھی غزل کی شکل کے گوہر سنوارتے

رکھتے چھپاکے عیب، جو دلکش نقاب میں
ہم کو بھی بُت کی شکل میں آذر سنوارتے

آرائشِ حیات سے، ہم کو نہ تھا گریز
بجھتی شکم کی آگ تو گھر در سنوارتے

ہیں گفتگو ایک سلیقہ شعار ہم
گزری ہے عمر، لفظوں کے تیور سنوارتے

ایسا نہ تھا کہ شعر کی اوقات کچھ نہ تھی
کچھ توسیں خیال سخنور سنوارتے

خود ہی دراز دست ہے، جن کی ہوں ظفر
کیا ملک وقوم، ایسے گداگر سنوارتے!!

□□□

جہاں ہے خیر، وہیں شر بپا ہے برسوں سے
وہیں ہے سنگ، جہاں آئینہ ہے برسوں سے

اڑی نہ گرد، نہ کوئی چلا ہے برسوں سے
وفا کا راستہ سونا پڑا ہے برسوں سے

وہ دل جو ٹوٹا ہوا آئینہ ہے برسوں سے
سلامت اُس میں سراپا ترا ہے برسوں سے

بہت طویل سفر کر چکا ہوں ملے اس پر
یہ راستہ جو مرے زیرِ پا ہے برسوں سے

نہ جانے کتنے فسانے ہیں اس ذات میں گم
وہ ایک پیڑ جو یوں ہی کھڑا ہے برسوں سے

ہتھیلیاں کسی شیریں کی ہوں، کہ لیلیٰ کی
دلوں کے خون کی سب پر رچا ہے برسوں سے

ہزار بار ملے، پھر بھی گفتگو نہ ہوئی
میں اُس کا اور وہ مرا آشنا ہے برسوں سے

جسے خرید نہ پائی، خود اُس کی محرومی
تباہ حال وہ محوِ انا ہے برسوں سے

بنا ہوا ہے جو خود اپنی ذات کا مرکز
وہ منزلوں کے لیے تشنہ پا ہے برسوں سے

ظفر نکل نہ سکے، اپنی ذات سے باہر
ہمارے گرد بھی اک دائرہ ہے برسوں سے!!

□□□